اُردو ناول میں

پسماندگی کا رُجحان

(نولکھی کوٹھی اور کماری والا کے تناظر میں)

انیلہ مشتاق

اُردو ناول میں

پسماندگی کا رجحان

(نولکھی کوٹھی اور کماری والا کے تناظر میں)

انیلہ مشتاق

حسنِ ادب فیصل آباد

03217044014

Urdu Novel main

Pasmandgi ka rujhaan

By

Aneela Mushtaq

ARI ID: 1688708340819

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

ضابطہ

نام کتاب:	اردو ناول میں پسماندگی کا رجحان (نولکھی کوٹھی اور کماری والا کے تناظر میں)
تحقیق نگار:	انیلہ مشتاق
نظرِ ثانی:	ڈاکٹر مشتاق عادل
اہتمام:	حسنِ ادب فیصل آباد
سرورق:	ڈاکٹر عارف حسین عارف
کمپوزنگ:	محمد مظہر قیوم
باراول:	جنوری 2023
تعداد :	500
قیمت :	500روپے

انتساب

اپنی پیاری

والدہ محترمہ

خالدہ مشتاق

کے نام

فہرست

❖ سخن ہائے گفتنی ۷۔۸

❖ علی اکبر ناطق ۔۔۔سوانح وتخلیقات ۹۔۴۲

ولادت، ابتدائی تعلیم وتربیت، معاشی حالات، خاندانی پس منظر، بہن بھائی، عائلی زندگی، ادبی زندگی کا آغاز،ادب میں دلچسپی، ملازمت ، پہلی اشاعت پر کامیابی، اعزازات، مطبوعہ کتب، غیر مطبوعہ کتب، تخلیقات، بے کفن بستیوں میں، یاقوت کے ورق، سرمنڈل کا راجہ، ریشم بنا کھیل نہیں، سبز بستیوں کے غزال، سفیر لیلیٰ، فکشن، قائم دین، شاہ محمد کا ٹانگا، فقیر بستی میں تھا، نولکھی کوٹھی، کماری والا، تنقید نگاری، انڈیپینڈنٹ اردو، درعدالتِ علے، سیاسی نظریہ، مذہبی نظریہ۔

❖ اردو ناول میں پسماندگی کے مظاہر ۴۳۔۷۸

ناول کے عناصرِ ترکیبی، اردو ناول میں پسماندگی کے مظاہر، نولکھی کوٹھی، خس و خاشاک زمانے، لے سانس بھی آہستہ، آگ، فائر ایریا، دکھیارے، نادار لوگ،

❖ نولکھی کوٹھی میں پسماندگی کے مظاہر ۷۹۔۱۳۰

پلات، مرکزی کردار، منظر نگاری، شاعرانہ رنگ، پسماندگی کے مظاہر، غربت وافلاس جبری مشقت اور تشدد، طاقت کا زور، حاکم ومحکوم میں فاصلہ، قانون کے ساتھ بڑے لوگوں کا کھلواڑ، کلرکوں کا غیر منصفانہ رویہ، ذاتی مفادات اور عناد پر لڑائی جھگڑے، رشوت ستانی، عوام کا استحصال، ملاؤں کا پروپیگنڈہ، الیکشن میں دھاندلی، مسلم سکھ تصادم اور قتل وغارت، مہاجرین کے ساتھ ناروا سلوک،

❖ کماری والا میں پسماندگی کے مظاہر ۱۳۱۔۱۷۶

پلاٹ ، کردار، جزئیات نگاری، مقصدِ حیات، پسماندگی کے مظاہر، دیہات میں قابل ڈاکٹروں کا فقدان، لوطی حرکات، ہم جنس پرستی، جہاد کے نام پر اغوا کا کاروبار، جائیداد کا تنازعہ، نسل در نسل دشمنی، کرپشن، نجی مفادات اور غداری، پروڈکشن کے نام پر جنسی استحصال، ادب کے نام پر فحش رسالے چھاپنا، مذہبی زوال کی عکاسی۔

❖ کتابیات ۱۷۷

بنیادی ماخذات ۱۷۷

ثانوی ماخذات ۱۷۷

رسالہ جات ۱۷۸

لغات ۱۷۹

❖❖❖❖❖❖❖❖

سخن ہائے گفتنی

اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔سرور دو عالم حضرت محمد ﷺ اور ان کی آل پر کروڑوں درود وسلام پیش کرتی ہوں۔ بعدازاں صدق دل سے دعا ہے کہ اللہ پاک کی ذات میرے والدین کا سایہ ہمیشہ قائم رکھے، جن کی رہنمائی، تربیت اور حوصلہ افزائی سے میرے لیے لفظ شناسی سے لفظ فہمی تک کے تمام مراحل آسان ہو گئے۔

یہ دستاویز جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس کے منزل مقصود تک پہنچنے کی داستان کچھ یوں ہے۔میری والدہ محترمہ کی دلی خواہش رہی کہ میری بیٹی ایم فل اردو کرے۔ان کی اسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں نے معلومات اکٹھی کرنے کی سعی کی۔میری کچھ رفقائے کار نے کہا کہ آپ بس شروع کریں، پتہ بھی نہیں چلے گا اور مکمل ہو جائے گا لیکن ان دوستوں کے لیے میرا بھی ایک پیغام ہے کہ چلنے والوں کو ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ سفر کیسا رہا۔ان سب کے لیے بھی میری دعائیں ہیں کہ خوش رہیں۔ میں اپنی پیاری بہن عروسہ کا جس نے کتابیں خریدنے میں میری مدد کی اور اپنے شفیق بھائیوں محمد ساجد اور محمد ماجد کا بھی دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے موسموں کی شدّت کو نظر انداز کرتے ہوئے تحقیق کے مشکل مراحل کو کامیابی سے طے کرنے میں بھرپور معاونت کی اور بغیر ناراضی کے مجھے بروقت منزل پہ پہنچایا۔

میں نے 16 اکتوبر 2020ء کو یونیورسٹی آف سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔داخلے کے بعد معلوم ہوا کہ اگلے دن سے ہی کلاسز کا سلسلہ شروع ہوگا۔تین میقات مسلسل کلاسز میں حاضری دی۔تمام اسائن منٹس، پریزینٹیشنز، کوئزز اور امتحانات اساتذہ کی رہنمائی اور والدین کی دعاؤں سے بہت اچھے رہے اور اس تعلیمی سفر کا مشکل مرحلہ جو آیا وہ کورس ورک یا تحقیقی کام کا انتخاب کرنا تھا میں نے تحقیقی کام سے ایم ایس اردو کی ڈگری مکمل کرنے کا فیصلہ کیا، جس کے لیے میں میرے نگران مقالہ محترم استاد یوسف اعوان صاحب اور بالخصوص صدر شعبہ اردو ڈاکٹر مشتاق عادل کی بے حد شکر گزار ہوں۔

میرے نگران مقالہ ڈاکٹر یوسف اعوان سے جب بھی میں نے رہنمائی کے لیے درخواست

کی تو انہوں نے مجھے اپنی شفقت سے نوازا۔ ان کے پر خلوص انداز گفتگو نے مجھے ان سے مقالہ سے متعلق ہر سوال پوچھنے میں ہمت دی۔ جس طرح سے انہوں نے مجھے مواد کی فراہمی سے لے کر مقالے کی ترتیب تک ہر مرحلے میں میری پر خلوص مدد کی اور عرق ریزی کے ساتھ میری اغلاط کو درست کیا اس کے لیے میں ان کی بے حد ممنون ہوں۔

شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر یاسمین کوثر صاحبہ، ڈاکٹر عامر اقبال صدیقی اور ڈاکٹر عبدالستار نیازی نے بھی میری وقتاً فوقتاً رہنمائی فرمائی۔ میں علی اکبر ناطق کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ جنہوں نے میرے تحقیقی کام کے سلسلے میں بھرپور تعاون کیا۔

تحقیق کے اس سفر میں، میں اپنی والدہ محترمہ کی بہت شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اپنی محبت اور حوصلہ افزائی سے اس تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری ہر ممکن حد تک مدد کی، میرے حوصلے کو اپنی ملائم اور پیار بھری گفتگو سے میری قوت ارادی کو مضبوطی کی طرف مائل کیا اور ہمیشہ مجھے ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔ یہ انہی کی دعاؤں کا ثمر ہے کہ میں اپنے اس تحقیقی کام میں سرخرو ہوئی۔ میرا رواں رواں ان کی محبت کا مقروض ہے کہ جن کی تربیت اور دعاؤں کے سایہ میں شاہراہ حیات کے پُر پیچ حالات میں بھی میں نے اعتماد سے چلنا سیکھا۔ اللہ تعالیٰ میرے والدین کو خوشیوں سے بھرپور صحت والی زندگی سے نوازے۔ میں متذکرہ بالا اساتذہ، دوستوں اور والدین کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحت و سلامتی کے ساتھ اپنی رضا سے نوازے رکھے۔ (آمین)

تحقیق کارِ مشکل ہے اس لیے میرا یہ کام کس حد تک اپنے تقاضے پورے کر پایا ہے، یہ جانچنا میرے قارئین کا کام ہے۔ مجھے اپنے مکرم و محترم قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا۔

انیلہ مشتاق

جنوری ۲۰۲۳ء

علی اکبر ناطق۔۔۔سوانح وتخلیقات

علی اکبر ناطق پاکستانی ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر اور نقاد ہیں۔عصری اردو ادب میں 'علی اکبر ناطق' ان شخصیات میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جو پچھلی دہائی میں اردو ادب کے افق پر ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ادب کی بہت ساری جہتوں میں مصنف مذکور نے اپنی قسمت آزمائی ہے اور وہ اس میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔شاعری، ناول نگاری، افسانہ نگاری اور تنقید مصنف کے اہم میدان ہیں شاعری میں ان کی پانچ کتابیں ہیں''سبز بستیوں کے غزال''غزلیات کا مجموعہ جبکہ'' بے یقین بستیوں میں''،''یاقوت کے ورق''،''سر منڈل کا راجہ''،''ریشم بننا کھیل نہیں'' ان منظومات کے مجموعے ہیں۔حال ہی میں انہوں نے اپنے ادبی سفر میں ایک اور کتاب کا اضافہ کیا ہے جس کا نام''سفیر لیلیٰ'' ہے ،اس میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں''ریشم بننا کھیل نہیں'' کتاب میں مصنف مذکور نے اپنی تینوں کتابوں (نظموں) کے مجموعے کو ایک ہی جلد میں شائع کروایا ہے جو سانجھ پبلی کیشنز سے 2019ء میں شائع ہوئی۔تینوں مجموعوں کے دیباچے بھی اس کتاب میں ایک ساتھ شائع کیے گئے ہیں اس کے علاوہ دو افسانوی مجموعے اور ناول نگاری میں ناطق کے ناول''نولکھی کوٹھی''اور''کماری والا'' ادبی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔محمد حسین آزاد کا مرقع لکھنے کے ساتھ ساتھ تنقید پر بھی ایک کتاب''ہئیت شعر'' شائع ہو چکی ہے۔مصنف کی کچھ کتابیں ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ہر وہ مصنف جو ادب کی مختلف اصناف پر کام کر چکا ہو اور صفِ اول کا ادیب جانا جائے تو اس کی ادبی جہات کا مطالعہ اپنی جگہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

ولادت

ناطق کی ولادت 15 اگست 1976ء میں اوکاڑہ کے قریب چک 32 ایل کے نام سے مشہور گاؤں میں ہوئی۔وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی اسی گاؤں سے حاصل کی۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

ناطق نے اپنے گاؤں چک 32 ایل سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد ایف اے کے لیے گورنمنٹ کالج اوکاڑہ کا رخ کیا، جہاں ایف اے کی سند حاصل کی انہوں نے اپنا تعلیمی سفر پرائیوٹ طے کیا۔ گریجوایشن بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے پرائیویٹ طالب علم کے طور پر مکمل کی۔ ایم اے کی ڈگری نمل یونیورسٹی اور پھر ایم فل منہاج یونیورسٹی لاہور سے مکمل کیا۔ انہوں نے آرٹس کو سائنس پر ترجیح دی اور اپنی ساری تعلیم آرٹس میں مکمل کی۔

معاشی حالات

ناطق کے معاشی حالات درست نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے تعلیمی سفر کے آغاز میں تعلیم کے ساتھ ساتھ مزدوری کے فرائض بھی سرانجام دیے اور اپنے معاشی حالات کی وضاحت کرتے ہوئے مزید بتایا کہ جماعت ہفتم تک ان کے پاؤں میں جوتا نہیں ہوتا تھا۔

خاندانی پس منظر

ناطق کا خاندان برصغیر ہند کی تقسیم کے وقت ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تھا۔ وہ اس ہجرت سے خائف تھے۔ ان کے والد محترم کا نام بشیر تھا۔ ان کی عمر 12 سال تھی، جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئے اور پھر یہیں مقیم ٹھہرے۔ انہوں نے تقسیم کے وقت کے مشکل حالات سے نبرد آزما ہو کر پاکستان آنے والے اپنے خاندان کی تعداد 20 بتائی ہے جو کہ زندہ بچ گئے تھے لیکن جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر رہے تھے تب تقریباً 70 لوگ قافلے میں شریک تھے مگر جب ہیڈ سلیمانکی کے راستے وہ انڈیا سے پاکستان پہنچے تو تقریباً 50 لوگ شہید ہو گئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ مشکلات کا سلسلہ یہیں پر نہیں رکا بلکہ پاکستان آنے پر جب اوکاڑہ کے قریب ایک گاؤں میں بس گئے تو ان کے پاس جگہ کی دستاویزات موجود نہ ہونے کی وجہ سے بھی بے شمار پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہجرت کے دوران خاندان کے پاس تمام جمع پونجی بھی لوٹ لی گئی اس لیے انہیں شدید غربت و افلاس کے حالات سے گزرنا پڑا سادہ طبیعت انسان ہونے کی وجہ سے تمام معاملات سے لاعلم تھے، نہ کوئی سہولت تھی نہ کوئی ذریعہ معاش تھا پھر وہ بتاتے ہیں کہ ان کے والد معمار

بھی تھے اور معماری کو اپنا پیشہ بنایا اور یہی کام وہ کئی سال تک کرتے رہے۔ پھر یوں ہوا کہ والدہ ماجدہ بیمار پڑ گئیں تو موجود تمام جمع پونجی بھی ان پہ صرف ہو گئی تب ناطق کے ابا جان نے مڈل ایسٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ معماری کا کام انھوں نے وہاں بھی جاری رکھا اور تقریباً چار سال کا عرصہ وہاں گزارا۔ چار سال تک وہ ایران اور شام محنت مزدوری کرتے رہے پھر پاکستان واپسی کے لیے رخت سفر باندھا۔

یہاں آنے پر والد نے خود کو زمینداری کے کام سے منسلک کر لیا اور واپسی پر جب وہاں کی ثقافت اور کلچر کے بارے میں ناطق کو بتایا تو ان کے دل میں بھی وہاں جانے کا ارادہ ہوا اور پھر نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی مڈل ایسٹ روانہ ہو گئے، کیونکہ ناطق کے والد اور بھائی معماری کے پیشہ سے منسلک رہے ہیں اس لئے معماری ان کا خاندانی پیشہ ہے اور وہ خود بھی معمار رہے ہیں۔

بہن بھائی

علی اکبر ناطق اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں ان کے چھ بھائی ہیں۔ دو بھائی آرکی ٹیکٹ، کچھ کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور کچھ نے اپنا خاندانی پیشہ ''معماری'' جاری رکھا ہوا ہے۔ تمام بھائی ان سے چھوٹے ہیں۔ کل نو بہن بھائی ہیں ایک بہن تمام بہن بھائیوں سے چھوٹی ہے۔

ان کے چھوٹے بھائی اصغر جن کی وفات ایک حادثے میں ہوئی۔ وہ اپنی بہن کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کا نام خدیجہ تھا، وہ سکول ٹیچر تھیں، ان کا قتل ان کے شوہر نے کیا تھا اور ناطق وجہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کے شوہر نے ان کا قتل انشورنس کے پیسوں کے لیے کیا تھا۔

عائلی زندگی

ناطق کی شادی 2010 میں ہوئی۔ ان کی زوجہ پاک آرمی میں ڈاکٹر تھیں۔ ان کی شادی تقریباً 5 سال رہی لیکن یہ شادی مزید نہ چل سکی اور بیوی سے علیحدگی ہو گئی یعنی 2015ء میں طلاق ہو گئی۔ انہوں نے شادی کا دوبارہ تا حال نہیں سوچا۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹی جیسی رحمت سے نوازا جس کا نام ''وجیہہ فاطمہ'' ہے۔ بیٹی اپنی والدہ کے ساتھ لاہور میں ہی رہتی ہیں۔

ادبی سفر کا آغاز

ناطق کے ادبی سفر کا آغاز بچپن سے ہی ہوا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ شروع میں مصوری کرنا انھیں پسند تھا اپنے دوستوں کی ڈرائنگ کا پیاں بنایا کرتے تھے۔ پھر مجسمہ سازی میں بھی اپنا ہنر آزمایا۔ وہ ادبی سفر کے آغاز میں اپنے تجربات بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ہمارے گھر کے پاس ایک شیشم کا درخت تھا جس پر ایک دن کوئل بیٹھی تھی۔ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر جا بیٹھی تو اسے دیکھ کر میں نے کہا کہ یہ تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ تو میں نے بھی ویسے ہی کرنے کی کوشش کی لیکن میں منہ کے بل نیچے خس وخاشاک پہ آگرا۔ اسی طرح کے تجربات میں کرتا رہتا تھا۔ ہر چیز کو آزمایا اور آزمانے کے بعد نتیجہ نکالا کہ یہ میں کرسکتا ہوں اور یہ میں نہیں کر پاؤں گا۔"(1)

تجربات کے بعد جب ناطق نتیجہ نکالتے تو وہ اس چیز کو ترک کر دیتے جو وہ نہیں کر پاتے تھے مگر وہ اسے دیکھ کر کرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ پھر کتابیں پڑھنا شروع کیں تو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ یہ کتنا اچھا لکھا ہوا ہے اور پھر یہ شوق بڑھتا گیا بچپن میں ہی اپنے دوستوں پر خاکے لکھنا شروع کر دیے اور شاعری کرنا شروع کر دی وہ بتاتے ہیں کہ شاعری کی طرف پہلے راغب ہوا۔ ناطق کا خاندان جب ہجرت کر کے پاکستان آیا تو اتنے مشکل حالات میں بھی ان کے دادا جان جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر کمال عبور رکھتے تھے۔ ہندوستان سے اپنی کتابیں ساتھ لانے میں کامیاب رہے، وہ ان کی ادب سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے بچپن میں اپنے دادا کی کتابیں پڑھتے تھے۔ کہانیاں پڑھنے کا شوق وہ بچپن ہی سے رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر کے پاس ایک ہائیر سیکنڈری سکول کی لائبریری کے بارے میں بتایا۔ جسکی بنیاد 1979ء میں رکھی گئی۔ یہ لائبریری جس کا سنگ بنیاد مشہور شاعر مصطفی زیدی نے رکھا یونین کونسل کی عمارت میں بنائی گئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہ وہاں پڑھنے جایا کرتے تھے کیوں کہ وہاں ادبی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔

ادب میں دلچسپی

ناطق کو بچپن ہی سے ادب میں گہری دلچسپی تھی بتاتے ہیں کہ وہ میٹرک تک نصاب کی کتابیں نہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ دوسری کتابوں کو پڑھنے اور گھر کے پاس سکول کی لائبریری جانے میں زیادہ دلچسپی تھی اور بقول ان کے انھوں نے بچپن میں ہی ایسی کتابیں پڑھ رکھی تھیں جن میں کسی کو کم ہی گہری دلچسپی ہوسکتی ہے مثلاً ''داستان امیر حمزہ''''الف لیلا'' یہ کتابیں وہ بچپن میں ہی پڑھ چکے تھے اور ان میں سے بہت سے صفحات ان کو زبانی یاد بھی تھے ایک دلچسپ واقعہ جس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> ''آب حیات کتاب جب میں نے پڑھی تو وہ مجھے ایسے ماحول اور کلچر میں لے گئی کہ وہ کتاب میں نے تقریباً چالیس دفعہ پڑھی ہوگی جب بھی پڑھتا ہوں تو ایک نیا لطف آتا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاعر ایسے ہوتے ہیں یہ تو بہت اچھے لوگ ہیں اور ان کی حرکتیں بھی مجھے راس آئیں اس میں جتنے شاعر تھے میرے لیے خاص طور پر ان دنوں وہاں مجھے انشاء جی بہت بھائے جس طرح مولوی آزاد صاحب نے مصحفی ساتھ ان کی مبالغہ آرائی کروائی ہے۔ بچپن میں ایک بندے کو ہیرو کی طرح سمجھ لیا جاتا ہے میرے لیے مصحفی ان دنوں ولن تھا مولوی آزاد نے ان کو ولن بنا کر رکھ دیا تھا۔ اب ہوش آیا تو پتا چلا مولوی آزاد کیسے کھیل کھیلتے تھے۔(2)

کتابوں سے دلچسپی ان کی نہ صرف ادب سے راہیں ہموار کرتی گئی بلکہ ادبی دنیا میں ممتاز لکھاری کے طور پر پہچان کا باعث بنی۔

ملازمت

ناطق بچپن ہی سے بہت محنتی تھے اس لیے سکول سے واپس آنے کے بعد اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کیا کرتے تھے۔ ناطق نے ''اے ایس آئی'' اور اس کے بعد ''سیکنڈ لیفٹننٹ'' کے لیے بھی ٹریننگ میں حصہ لیا مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا دونوں جگہ ہی ٹریننگ کو ادھورا چھوڑ دیا کیوں کہ ان کی طبیعت مطمئن نہ ہوسکی۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں بطور سپر وائزر کام کیا لیکن

اسے بھی چار سال کے بعد چھوڑ دیا۔

انہوں نے جب اپنے ابا جان سے باہر کے ممالک کی ثقافت کے بارے میں سنا تو خود بھی وہاں چلے گئے۔ وہاں محنت مزدوری کی، پیٹ پالنے کی غرض سے چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کی۔ انہوں نے وہاں لوگوں کے اونٹ بھی چرائے، کھجور ڈھونے کا کام بھی کرتے رہے لیکن جیسا ان کی طبیعت میں ہی پایا جاتا ہے کہ کسی بھی کام میں مستقل مزاج نہ رہے وہاں سے بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان واپس آن بسے اور یہاں آ کے دوبارہ معماری کا کام شروع کر دیا۔ ناطق نے ایک شاپ کے انچارج ہونے سے لے کر معلم کے تمام فرائض ادا کیے۔ معماری کے کام کو خیر آباد کرنے کے بعد جو کام شروع کیا وہ ایک بک شاپ کے انچارج کا تھا۔

انہوں نے 2006ء میں ''اکادمی ادبیات اسلام آباد'' میں بطور انچارج خدمات سرانجام دیں۔ 2006ء سے لے کر 2009ء یعنی تین سال تک وہاں ادب کی خدمت کی۔ 2009ء میں اکادمی ادبیات اسلام آباد سے کام چھوڑ کر ''فیڈرل ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن'' میں نوکری کی۔ وہاں خوب محنت اور دل جمعی سے کام کیا مگر کچھ سال کی ملازمت کے بعد ہی اس نوکری کو بھی خیر آباد کہہ دیا اور ''مقتدرہ قومی زبان'' میں ملازمت اختیار کی اور اپنے اندر چھپی لکھاری کی صلاحیتوں کو مزید نکھارا اور اپنی علمی ادبی صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔

2013ء تک اس ادارے سے منسلک رہے اور پھر واپس فیڈرل ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن میں چلے گئے۔ اپنی ذہنی تسکین وراحت کے لیے 2012ء سے 2016ء تک اسوہ کالج اسلام آباد میں معلم کے فرائض انجام دیے اس کے بعد اسلام آباد کو بھی چھوڑ کر لاہور کی طرف رخ کیا۔ جہاں ''یونیورسٹی آف لاہور'' میں بحیثیت معلم اپنے فرائض سرانجام دیے اس کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور لاہور منہاج یونیورسٹی سے ایم فل اردو کی ڈگری مکمل کی۔ 2019ء میں ناطق نے یونیورسٹی آف لاہور سے بھی ملازمت کو خیر آباد کہہ دیا۔ ان کی ملازمت کے اس سلسلے کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں بس سیکھنے کا جنون تھا۔

پہلی اشاعت پر کامیابی

ناطق کی پہلی دس نظمیں 2009ء میں چہار ماہی رسالہ دنیا زاد میں شائع ہوئی۔ایک منفرد لکھاری اور ایک نیا اچھوتا انداز تحریر ہونے کی وجہ سے ادبی دنیا میں پہلی ہی اشاعت پر کامیابی ملی،پہلی بار ہی جب یہ نظمیں رسالہ میں چھپی تو منفرد لکھاری کے طور پر پہچان کا باعث بنی ان کے پہلے مجموعے میں یہ دس نظمیں شامل ہیں۔ان کی اس شاعت کے بعد 2009ء میں"آج" نامی رسالہ میں ان کے پانچ افسانے چھپے۔ناطق کو جب ان کی پہلی اشاعت پر ہی کامیابی کا سامنا رہا تو اردو ادب کے بڑے بڑے لکھاریوں نے ان کو اس کام پہ مبارکباد دی۔

اعزازات:

ناطق کا پہلا شعری مجموعہ''بے یقین بستیوں میں''رسالہ''آج''میں کراچی سے 2010ء میں شائع ہوا۔ان کی نظموں کو بہت سراہا گیا اس لیے اس مجموعہ کو''یو بی ایل''اعزاز کیلئے بھی نامزد کیا گیا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ''قائم دین''آکسفورڈ سے چھپا اور نشر میں ان کے اس پہلے افسانوی مجموعے کو''یو بی ایل''ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مطبوعہ کتب:

علی اکبر ناطق کی مطبوعہ کتب کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔	بے یقین بستیوں میں (نظمیں)	2010ء
۲۔	یاقوت کے ورق (نظمیں)	2013ء
۳۔	سرمنڈل کا راجہ (نظمیں)	2017ء
۴۔	ریشم بنا کھیل نہیں (تینوں نظموں کے مجموعہ کا کلیات	)2019ء
۵۔	سبز بستیوں کے غزال (غزلیں)	2018ء
۶۔	قائم دین (افسانے)	2010ء
۷۔	شاہ محمد کا ٹانگہ (افسانے)	2017ء
۸	نولکھی کوٹھی (ناول)	2014ء
۹۔	کماری والا (ناول)	2020ء

۱۰۔ ہئیت شعر (تنقید) 2016ء

۱۱۔ فقیر بستی میں تھا (مرقع آزاد) 2019ء

۱۲۔ سفیر لیلی (نظمیں اور غزلیں) 2022ء

۱۳۔ درعدالت علی (منقبت) 2020ء

غیر مطبوعہ کتب

ناطق ایک انوکھا ادیب ہے، جس کا شمار ان عصری ادب کے ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے عصری دور کو اپنے متاثر کن کام سے حیران کیا ہے، جو تہذیب اور تاریخ کی ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ اردو ادب میں ناطق کا کام حیرت زدہ کرنے والا ہے۔ کیونکہ وہ حقیت اور کہانی کے پیچیدہ پہلوؤں کو لے کر سامنے آتا ہے۔ ان کی غیر مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں: ''کوفے کا مسافر (ناول)'' ناطق نے اپنے لکھنے کا آغاز شاعری سے کیا، نظم لکھنا سب سے پہلے شروع کی۔ ان کی ادبی تخلیقات کا مختصراً جائزہ کچھ یوں ہے۔

تخلیقات

ناطق نے شاعری سے آغاز کرتے ہوئے نثر میں بھی قسمت آزمائی اور بطور نقاد بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ شاعری میں نظمیں اور غزلیں دونوں میں ایک انوکھا پن نظر آتا ہے یقیناً یہ ان کی تخیل پہ گرفت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ افسانوں میں ایک خاص قسم کا رنگ نظر آتا ہے معاشرے کی نمائندگی کرتے کرداروں میں بھی وہی مزاج پایا جاتا ہے جہاں وہ معاشرے کے رہن سہن کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں۔ ناول نگاری میں ان کو دیہات اور اس کے کرداروں کی باز یافت کا آدمی کہا جاتا ہے۔ وہ کرداروں کو حقیقت کی زندگی دینے والے ہیں، پڑھتے ہوئے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ان کرداروں میں سے ایک کردار ہے جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ دیہاتی زندگی کو اس قدر وضاحت سے بتاتے ہیں کہ ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، اپنے ناول نولکھی کوٹھی اور کماری والا دونوں ہی میں انہوں نے دیہاتی زندگی کے مناظر بیان کیے ہیں۔ ان کی تخلیقات کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

بے یقین بستیوں میں

ناطق کو ادبی سفر کا آغاز کیے تھوڑا ہی عرصہ ہوا جب انہوں نے شاعری کی اس پہلی کتاب سے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے اس مجموعہ کلام میں انہوں نے کچھ ایسی نظمیں لکھی ہیں جن کو پڑھ کر بعض اوقات انسان پر خوف طاری ہو جاتا ہے، ہر نظم میں ایک نادر بات ہے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کتاب کی پہلی نظم کا عنوان ''ریشم بننا کھیل نہیں'' اپنے آپ میں ایک بہت گہرائی میں لے جانے والا مطلب رکھتا ہے۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ شاعری کرنا آسان نہیں۔ ان کی ایک نظم جس کا پہلا مصرع کچھ یوں ہے:

میں بانسوں کے جنگل میں ہوں جن کے نیزے بنتے ہیں

نیزہ کی تعریف، مین اگر ہم سمجھیں تو بات سیدھی دل کو لگتی ہے یعنی بانسوں کو چھیل کر ہم نیزے بناتے ہیں۔ بانسوں کے جنگل کو ناطق نے انسانوں سے تشبیہ دی ہے دنیا انسانوں کا جنگل ہے، جہاں طرح طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ یہ چاہیں تو بانس سے نیزہ بنا ڈالیں یا پھر قلم۔ ایک اور مصرع جس میں وہ افسوس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں ساری بات کھل کر سامنے آجاتی ہے اور واقعی احساس ہوتا ہے یہ دنیا کالے ناگوں سے بھری پڑی ہے جہاں ان ناگوں میں رہ کر اچھے لوگ اچھائی کا دم بھرنے والے بھی کالے ناگ بنتے جاتے ہیں بہت کم لوگ ہیں جو ان کالے ناگوں سے خود کو بچا پاتے ہیں۔

ناطق کی نظم کا آخری مصرع بھی یہی ہے کہ ''لیکن جنگل بانسوں کا ہے جن کے نیزے بنتے ہیں۔'' یہاں صرف ناگ رہتے ہیں اور ان ناگوں سے مصنف کو کوئی امید نہیں کہ وہ ان سے قلم بنائیں گے۔ جب ان کی نظمیں پڑھتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ باتیں معمار کے دل سے نکلتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کہتی ہیں:

> ''واہ! دل نے کہا تھا۔ یہ کوئی علی اکبر ناطق ہیں کیسی اوریجنل، ایک سچی تپش رکھنے والی آواز! بہت دنوں بعد ایسی نظمیں پڑھنے کو ملیں۔ بعد میں ایک دو رسالوں میں اس کی کہانیاں بھی پڑھیں۔ ان کا اپنا ایک نرالا رنگ، اچھوتا روپ! مبارک باشد اردو ادب! ایک ادیب نے بڑے طاقتور قلم کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا۔''(3)

ان کی شاعری کا یہ مجموعہ انسان اور انسانیت کے تمام پہلوؤں کو سامنے لے کر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے ماحول اور انسانوں کے رویوں پر احتجاج کر رہے ہیں اور قاری ان کے اس اچھوتے انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یاقوت کے ورق

ناطق کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں بھی انہوں نے نظموں کے ذریعے دل سے دل تک کا سفر طے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تب تک شعر نہیں کہتے جب تک ان کے پاس لکھنے کیلئے مسئلہ نہ ہو۔ وہ شاعری میں صرف احساسات کا اظہار کر کے لفظی ڈرامہ بازی نہیں چاہتے ہیں بلکہ وہ حقیقت کا رنگ بھرتے ہیں۔ وہ لفظوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ اس کتاب کا انتساب آپ نے اپنی بیوی رفیعہ پروین اور بیٹی وجیہہ بتول کے نام لکھا ہے۔ کل 36 نظموں پر مشتمل یہ مجموعہ ہے اور اس کتاب میں ناطق نے نظم ''سفیر لیلیٰ'' لکھی جو پندرہ صفحات پر مشتمل ہیاور کل 4 حصوں میں اس کو تقسیم کیا گیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ وہ داستان کے آدمی ہیں، ماضی، حال اور مستقبل کے آدمی ہیں۔ وہ کھنڈرات کو دیکھتے ہیں تو اندازہ کرتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ یہ تباہ و برباد ہوئے۔ انہیں ماضی سے لگاؤ ہے کیونکہ یہ ماضی ہمیں ہمارے حال مستقبل کی آگاہی دیتا ہے لیکن انسان کا مسلسل ماضی میں رہنا ہی انسان کو پیچھے دھکیل لے جاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب ''سفیر لیلیٰ'' نظم ان کے ذہن میں آئی تب ہی انھوں نے سوچا کہ انھوں نے ایک عظیم داستان سنانے کی ذمہ داری لے لی ہے۔

''سفیر لیلیٰ یہی کھنڈر ہیں جہاں سے آغاز داستان ہے
ذرا سا بیٹھو تو میں سناؤ
فصیل قریہ کے سرخ پتھر اور ان پہ اڑدر نشان برجیں گواہ'' (4)

نظم کے شروع میں ہی پڑھتے ہوئے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ اس سے اچھا آغاز اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ یہی وہ کھنڈر ہیں جس سے آغاز داستان ہے۔ یہاں سے کہانی شروع ہوئی اور ناطق نے اس کو چار حصوں میں لے جا کر داستان کا اختتام کیا، واقعی یہ ایک کمال تخلیق ہے۔

انسان لرز اٹھتا ہے جب اسے پڑھتے ہوئے داستان میں محسوس ہوتا ہے کہ عظیم انسان کس طرح ذلیل وخوار ہوجاتے ہیں۔ایک عظیم عمارت کس طرح کھنڈر میں بدل جاتی ہے۔اس کے عروج وزوال کو اس نے بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے،اسی طرح نظم کے اختتام میں بھی بہت ہی ہنر مندی سے داستان کو اختتام پذیر کیا ہے۔

"میں نامراد وخجل مسافر
مگر تمہارا امین مقاصد عزا کی وادی سے لوٹ آیا
اور اس نجیب وکریم محرم، وفا کے پیکر کو دیکھ آیا
جو آنے والے دنوں کی گھڑیاں ابد کی سانسوں سے گن رہا ہے"(5)

آخر میں آنے والے یہ مصرعے جیسے ناطق نے ساری نظم کو ایک راہ دی ہو وہ راہ جو کسی بھی انسان کیلئے ایک پیغام ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو تب ہی سے اسے اپنے آنے والے ہر دن کے ساتھ اپنی آخرت کا سامان کر لینا چاہیے۔یقیناً یہ نظم ''یاقوت کے ورق'' کی وجہ شہرت بھی ہے اور ان کے فن شاعری کا کمال بھی۔

سرمنڈل کا راجہ

سرمنڈل کا راجہ ناطق کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری کے دل میں جو تاثر رہ جاتا ہے وہ کچھ ایسا ہے کہ جب وہ اپنی ایک نظم کے بعد دوسری نظم لکھتے ہیں تو گویا ایک منزل پالی اور دوسری منزل کی طرف گامزن ہوجاتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں ایک ایسا قلعہ ایک ایسا پہاڑ سر کر لینا چاہتے ہیں جس کی بلندی تک پہنچتے پہنچتے خود ناطق راستے میں آنے والی ہر مشکل کو بھی جیسے خوش دلی سے سراہ رہے ہوں۔سرمنڈل کا راجہ میں وہ دیسی رنگ ڈھنگ کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔نظمیں پڑھتے ہوئے قاری کو پنجاب کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے۔یقین سے باہر لگتی ہے یہ بات کہ ایک شاعر نے پنجاب کا ایسا رنگ تخلیق کیا ہے۔اس پر زیف شاہ اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناطق کی نظم کا بیج مٹی میں ضرور ہوتا ہے لیکن نظم اوپر اور اوپر اٹھتے

اٹھتے جاودانی آسمانوں کی وسعتوں سے ہم آہنگ ہوکر آفاقی اسطورہ
بن جاتی ہے جسے آپ غیر فانی اساطیر کے پہلو میں دیکھ سکتے ہیں۔'
(6)'

کتاب قاری پر ایک خوشگوار تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ پنجاب سے محبت اس کی مٹی کی خوشبو کے ساتھ ساتھ قاری خود کو پنجاب میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ وہ کوئی فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے پر قاری کے دل و دماغ میں یہ بات نقش ہوجاتی ہے۔

ریشم بننا کھیل نہیں

ناطق کی نظموں کے مجموعہ کو سانجھ پبلی کیشنز لاہور نے 2019ء میں ''ریشم بننا کھیل نہیں'' کے نام سے شائع کیا۔ تینوں کتابوں کے دیباچے بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ قارئین کیلئے ایک نادر تحفہ ثابت ہوا، الگ الگ مجموعوں کو پڑھنے کی بجائے سارا متن ایک ہی مجموعہ میں قارئین کی دلچسپی کو دوبالا کرنے کیلئے شائع کیا گیا۔ یقیناً یہ ایک عمدہ کاوش ہے۔ فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں کہ:

''علی اکبر جواں سال ہے اور ایوان ادب میں دلربا شان سے داخل
ہوا ہے۔ اس کا بے خوف مشاہدہ ادب کیلئے مسرت کی نوید ہے اس
کی شاعری میں بھڑکتے ہوئے شعلے چہار اطراف کو خاکستر کرتے
نظر آتے ہیں۔''(7)

ریشم بننا کھل نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک ایک نظم سے یہ ریشم بنا ہے۔ تینو ں کتب کو ایک ہی جلد میں لے آنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ قاری کے لئے مسرت کی گھڑی ہے کہ اسے ناطق کی شاعری کو ایک ساتھ پڑھنے کا موقع ملا۔ یقیناً یہ ایک عمدہ کاوش ہے۔

سبز بستیوں کے غزال

سانجھ پبلی کیشنز سے 2018ء میں چھپنے والا ناطق کی غزلیات کا ایک مجموعہ سر بستیوں کے غزال بھی ہے۔ اس کتاب کا انتساب شمس الرحمان فاروقی کے نام ہے اس میں کل 54 غزلیں شامل ہیں۔ اس میں انہوں نے پنجاب کی سرزمیں، کھیت کھلیان، پھل پھول، ہریالی یہاں تک کہ پنجاب میں

جڑے رشتے ،اسی مٹی سے اٹھنے والی خوشبو اور اس سرزمین کے لیے جان دے دینے والے رشتوں کو اردو غزل میں شاعری کے ذریعے پروان چڑھایا ہے۔

علی اکبر ناطق نے اپنی تمام تر تحریری جمالیات کے ساتھ پنجاب کی خوبصورتی کو عیاں کر کے ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ان کی شاعری میں کچھ ایسے الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے جو کہ پنجابی کے ہیں یوں تو بہت سے شاعر حضرات ایسے ہیں جو اپنی شاعری میں پنجابی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔لیکن ناطق نے اردو غزل میں الفاظ کا اصل اور بالکل منفرد طریقے سے تخلیقی استعمال کیا ہے۔شمس الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''ناطق کی غزل اپنے قصے کی دیواروں اور کھیتوں کی سبز مٹی سے جڑی ہے اس کی زبان کا خمیر اپنی دھرتی کی خوشبوؤں سے اٹھا ہے۔اس کا ایک ایک مصرع اس کے اٹوٹ سمبندھ کی گواہی دیتا ہے۔یہ ہنر آفرین شعری طلسم کسی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ الہامی اور وجدانی توفیق کی جزا ہے جس میں ناطق کو اپنی شاداب وخوشی رنگ پائینوں والی دھرتی سے باندھے رکھا ہے۔''(8)

ناطق کی شاعری میں جس طرح منظر نگاری سے کام لیا جاتا ہے۔قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نقش بولتے ہیں۔ان منظروں میں وہ سماں ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ خود اپنی وضاحت کر رہی ہو۔حال میں ہونے والے اور مستقبل کی طرف اٹھتے تمام قدم ایک قطار میں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک کہانی کو سامنے لے آتے ہیں۔رنگوں میں حرکت پیدا کرنا کوئی ان سے سیکھے، نہایت ہی خوبیرت انداز میں انہوں نے اپنی ہر ایک غزل کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔

ان کی غزلوں میں جو پنجاب کا رنگ نظر آتا ہے۔اس نے غزلوں کی لطافت کو مزید بڑھا دیا ہے۔ندرت زبان،دل سے نکلنے والے الفاظ اتنے پرسوز اور دلنشیں ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہاں یہ بات بھی قابل بیان ہے کہ آج تک اردو ادب میں اپنے اندر اپنا حصہ بننے کے لیے کسی کو اتنی جلدی جگہ نہیں دی۔یہ بس ناطق ہی ہیں جنہوں نے قدرت کو اس طرح لفظوں میں بیان کیا ہے کہ ادب خود

ان کے رنگ میں ڈھل گیا۔ایک نیا طریقہ منفرد خیال کے ساتھ اردو ادب میں شامل ہو گیا۔اردو ادب میں اس قدر فطری طور پر قدرت سے لگاؤ نے ان کی شاعری کو ایک تازگی بخشی ہے۔وہ اپنی شاعری کے حوالے سے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرے سفر شر کی داستان طویل ہے اور قابل شنید ہے۔اس حرف و معنی کی کھیتی کی جمالیات اور آب و دانہ کی سیرابی کا عمل مدتوں پہلے شروع ہو چکا تھا۔جب اپنے دیہاتوں میں گائے پالنے اور مزدوری کے ساتھ کتاب کو ہم سفر رکھا ہوا تھا۔''(9)

اگر ہم ماضی کی بات کریں تو ایسے بہت سے شعرا ہیں جنہوں نے شاعری کی اور ان کے پایہ تک پہنچنا ناممکن رہا۔ان کی شاعری کو پڑھنے کے بعد بھی ویسا ہی سرور آیا کہیں ان میں میرا جی کا رنگ نظر آتا ہے تو کہیں انشا جی کلاسیک اردو شاعری ہر شاعر نے کی آج کے دور میں بھی ایسے شاعر کا ہونا بہت دل گردے کا کام ہے۔جس طرح وہ اپنی شاعری میں تلمیانت کا استعمال کرتے ہیں تو دل بیدل کو بھی یاد کیے بغیر نہیں رہتا ہے۔

آج کے دور میں لوگ شاعری کے معیار کو سمجھ نہیں پاتے اور اکثر تلمیحات کو سمجھ سے باہر سمجھتے ہیں شاعری سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔لیکن بات یہ سچ ہے کہ تلمیحات ہی سے شاعری کا معیار بنتا ہے یہ ان کی نادرالکلامی ہے کہ اس نے شاعر کے باطن میں ایسی ایسی خوبیاں چھپا رکھی ہیں جو سمجھ رکھنے والے یعنی اہل بصیرت ہی کو سمجھ آسکتی ہیں۔ان تمام باتوں سے لاعلم،شاعری کے بارے میں علم نہ رکھنے والا نوجوان یعنی نئی نسل کو ناطق کی شاعری پھیکی بھی معلوم ہوسکتی ہے مگر ان کی شاعری ایک خاص وزن اور معیار رکھنے والی شاعری ہے۔جس کو سمجھنا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ایک شعر جو کہ ان کی نادرالکلامی کا ثبوت ہے۔

یہ زندگی کا اک اک راستہ مژہ کی نوک پر کٹا
جگر کا ایک اک نگیں سفر میں خرچ ہو گیا
(10)

یقیناً یہ شعران کی نادرالکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اپنے فن کی بلندی کیلئے ایک فنکار ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور پھر اسی میں ختم ہوجاتا ہے۔ناطق کی شاعری میں چھپی ہوئی باتیں لفظوں کے معنی اور تلمیحات انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔سبز بستیوں کے غزال میں بھی شاعر نے جس منفرد انداز کو اپنایا ہے وہ ان کی ممتاز شاعری کی ایک زندہ مثال ہے۔

مصرعوں میں ایک ترنم ہے جو اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتا ایک ایسا انداز جو سننے والے کے کانوں میں بھی رس گھولتا ہے اور انھیں اس دنیا میں لے جاتا ہے، جہاں ناطق نے خود کو محسوس کر کے شاعری کی۔تمام شعروں کا ایک ربط مسلسل اس طرح سے تخیل کو آگے بڑھاتا ہے جس طرح درجہ بدرجہ وہ بلندی کے زینے چڑھ رہا ہو۔ان کی شاعری ان کے ہنر کا سب سے بڑا کمال ہے۔ارسلان راٹھور ناطق کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''میں یہ بات کہتے ہوئے کل ہچکچاتا تھا نہ آج کے لفظ کے جدید و قدیم سنگم اور اس کو برتنے کے حساب سے ناطق پچھلی کئی دہائیوں میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ناطق کے شعر پر مختلف حوالوں سے بات ہوسکتی ہے، استعارہ کی رعایتی ساخت سے لے کر علامت بننے کے عمل تک۔پھر تلمیح کو استعارہ بنا ڈالنے کی تکنیک، کلاسیکی مضامین کی توسیع اور معانی پیدا ہونے والا ارتفاع جس قدر ناطق کی دسترس میں ہے، میر، غالب اور انیس کی یاد تازہ کرتا ہے۔''(11)

وہ ترقی کے زینے چڑھتا ہوا ایک کمال فن رکھنے والا شاعر ہے۔اس کی شاعری میں موجود سحر قاری کو اس کی کتاب بار بار پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔مصرعوں میں موجود ترنم اور ربط قاری کے ذہن میں چھا جاتا ہے اور وہ مسلسل سوچوں میں گم ہوجاتا ہے ایسا کارنامہ ناطق کی ہی کاوش ہوسکتی ہے۔

سفیر لیلیٰ

سفیر لیلیٰ بھی ناطق کا شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں اور علی نام کی برکت بھی شامل ہے جہلم بک کارنر نے اسے شائع کیا ہے۔

علیؑ نام کا تلک لگایا علیؑ نام کی مالا
علیؑ نام سے جوڑا میں نے من کا دھرم شالا
(12)

ناطق نے اپنی کتاب سفیر لیلیٰ میں ''علی نام'' سے ایک نظم شامل کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کی کتاب میں علی نام کی برکت کے طور پر ہے۔علی نام کیلئے وہ عقیدت رکھتے ہیں اور یہی عقیدت ان کی اس کتاب میں پائی گئی۔وہ اس برکت کو اپنے لیے تحفہ سمجھتے ہیں اور اپنے تن من دھن کو علی نام کہ سپرد کرتے ہیں۔

فکشن

ناطق نے فکشن کا ہنر بھی آزمایا ہے البتہ ابتدا انھوں نے شاعری سے کی ہے۔فکشن میں ان کے دو افسانوی مجموعے دو ناول اور ایک سوانحی ناول شامل ہیں۔ان کو ادبی دنیا میں نثر کے حوالے سے بھی خاص مقام حاصل ہے۔ان کی فکشن کے حوالے سے درج ذیل کتابیں ہیں۔قائم دین (افسانے) شاہ محمد کا ٹانگہ (افسانے) نولکھی کوٹھی (ناول) کماری والا (ناول) فقیر بستی میں تھا (سوانحی ناول)۔

قائم دین (افسانوی مجموعہ)

قائم دین ناطق کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جسے 2010ء میں آکسفورڈ اور پھر 2018ء میں سانجھ پبلی کیشنز نے چھاپا یہ کتاب 128 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا انتساب افتخار عارف کے نام ہے۔یہاں ہر ایک افسانے کا الگ الگ جائزہ پیش کرنا مشکل ہے۔

مصنف مذکور نے مشاہدے کی کیا صورت حال بیان کی ہے۔اس کا طرز بیان کیسا ہے اس کے مطابق یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں انہیں زبان پر عبور حاصل ہے وہاں ان کا طرز بیان بھی نہایت سادہ اور جلد سمجھ آجانے والا ہے۔قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔قائم دین کے تمام افسانوں میں ان کا ایک خاص انداز تحریر ہیکہ قاری ایک ہی نشست میں تمام افسانے پڑھ لینا چاہتا ہے۔ہر افسانہ اپنے اندر ایک منفرد کہانی رکھتا ہے،قاری افسانے میں پڑھنے والے واقعات کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھتا ہے۔ظفر اقبال ناطق کے افسانوں پہ انھیں داد دیتیہوئے لکھتین ہیں کہ:

ہم تو جو ہیں جہاں سے آئے ہیں
آپ لیکن کہاں سے آئے ہیں
(13)

ناطق کا کام داد کے قابل ہے جو انھیں دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے ہر افسانہ اپنے اندر ایک امتیازی وصف رکھتا ہے۔ افسانوں میں موجود تمام کہانیاں حقیقت سے اس قدر قریب ہیں کہ قاری کو اپنی زندگی کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔

شاہ محمد کا ٹانگہ

ناطق کا یہ دوسرا افسانوی مجموعہ سانجھ پبلی کیشنز لاہور نے 2017ء میں شائع کیا، اس میں کل 14 افسانے موجود ہیں اور یہ 152 صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ وہ پنجاب کی زرخیز سرزمین کا باشندہ ہے اس لیے اس کی شاعری اور نثر دونوں میں پنجاب کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ افسانوں میں بھی انہوں نے اپنے اسی رنگ کو برقرار رکھا ہے۔ جس میں پنجاب کی ثقافت، بود و باش اور رہن سہن کو بہت ہی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی زندگی جہاں بسر کی ہے وہاں کی ہی کہانیاں لکھتا ہوں، وہ کہانیاں لکھتا ہوں جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے جواں اور بوڑھی ہوتی دیکھی ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میں یہ کہانیاں ان لوگوں کی نذر کروں جو ان کو سمجھتے ہیں اور جو دل کی بستیاں بساتے ہیں۔ علی اکبر ناطق اپنے افسانوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

'اپنے افسانوں کے متعلق صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے کسی بھی قسم کے فلسفے یا نظریے سے قطع نظر، فقط حقیقی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں بنانے کی کوشش کی ہے۔'' (14)

ان کا کہنا ہے کہ جہاں وہ رہتے ہیں جیسے بھی حالات ہوں اسے وہ لکھتے ہیں اور پنجاب کا رنگ غالب آتا ہے اگر وہ شہروں کا رخ کریں گے تو وہ اس کو بھی اپنی کہانیوں کا حصہ بنائیں گے اور یہ افسانے ان کی زندگی کے وہ واقعات ہیں جن کو انہوں نے معاشرے میں محسوس کیا، دیکھا اور پھر لکھا ہے۔

فقیر بستی میں تھا

ناطق نے ایم فل اردو منہاج یونیورسٹی لاہور سے کیا اور ان کا مقالہ محمد حسین آزاد پر تھا۔ اسی مقالہ کو انہوں نے دوبارہ تھوڑا تبدیل کر کے ایک نئے نام سے شائع کروایا یعنی فقیر بستی میں تھا یہ ایک سوانحی ناول ہے جسے انہوں نے اپنی تخلیقی مہارت کے ذریعے ایک نیا روپ دیا۔ ''فقیر بستی میں تھا'' عکس پبلی کیشنز لاہور نے 2019ء میں چھاپا۔ ناطق نے نہایت خوبصورتی سے اس کتاب کو 45 حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اپنے ہر ایک عنوان میں آزاد زندگی کا پہلو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا انتساب آغا سلمان باقر کے نام لکھا ہے۔ کتاب نہایت مہارت سے لکھی گئی ہے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے کیلئے کہاں کہاں کی خاک چھانی گئی ہوگی۔ انہوں نے آزاد کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناطق کی طرح قاری بھی کتاب پڑھ کر آزاد کا عاشق بن جائے گا۔ اس ضمن میں شہناز نقوی لکھتی ہیں:

> ''مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی seasons دیکھ رہی ہوں، عمدہ طرز بیان کو پڑھنے والا بھی مولانا آزاد کے ساتھ ساتھ خود کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ کتاب کا اسلوب اتنا پرکشش ہے کہ قاری کو کہیں بھی بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا ورنہ تحقیقی کتب پڑھنا ذرا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔''(15)

انہوں نے آزاد کی زندگی کو اس طرح لکھا کہ قاری بھی آزاد کا دیوانہ ہو جائے ناطق نے خود بھی آزاد کی کتاب جب آب حیات پڑھی تھی تو بار بار اس کتاب کو تقریباً چالیس مرتبہ پڑھا، اسی لیے ایم فل اردو میں اس عنوان پہ مقالہ تحریر کرنے کا فیصلہ کیا۔

نولکھی کوٹھی (ناول):

یہ ناول سانجھ پبلی کیشنز لاہور سے 2014ء میں شائع ہوا۔ اس کا انتساب محمد بشیر یعنی ناطق کے والد محترم کے نام ہے۔ یہ ناول 432 صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کو نثر میں اپنے ناول نولکھی کوٹھی سے کافی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے جس میں مختلف کرداروں کے ذریعے انہوں نے برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے واقعات کو پیش کیا ہے۔ ناول میں ایک کردار (انگریز) ولیم جس کے اردگرد

کہانی گھومتی نظر آتی ہے۔ جسے پنجاب کی زمین سے والہانہ محبت ہے جیسا کہ ان کی ہر ایک صنف ادب میں ہمیں پنجاب کا رنگ ملتا ہے اس میں بھی پنجاب کی سرزمین سے ان کی محبت عروج پر ہے۔ پنجاب کی ثقافت کی منظر کشی بہت باریک بینی سے کی گئی ہے۔ قاری خود کو محسوسات کی دنیا میں لے جاتا ہے اور تخیل کی پرواز میں اڑتا ہوا خود کو کہانی کے کرداروں کے آس پاس محسوس کرتا ہے یقیناً یہ ایک نادر کتاب ہے جس میں انھیں اپنی تخلیقی قوت کو پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے دشمنیوں میں بھی جو دیرینہ دشمنی کیا آثار دکھائے ہیں۔ انھیں بھی نہایت چابکدستی اور جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے بیان کیا ہے یہ ان کی ایک نادر تخلیق ہے۔ ناطق کے فن کو سراہتے ہوئے منہاس یوں رقمطراز ہیں:

> ''علی اکبر ناطق حیران کر دینے والا شاعر اور کہانی کار تو تھا ہی لیکن اب ناول نگاری کی دنیا کو نیا رخ دینے بھی آ پہنچا ہے۔ لگتا ہے یہ نوجوان لٹریچر کا کوئی پکھ بھی چھوڑنے کو تیار نہیں اور دل و دماغ کے گھوڑے کو وسیع میدانوں میں سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے'' (16)

شاعری میں فتح کے بعد ان کا فکشن میں قدم رکھنا بھی کامیاب رہا۔ فکشن میں قدم رکھتے ہی ناول ''نولکھی کوٹھی'' نے اچانک تہلکہ مچا دیا ہم عصر ادیب بھی مدح سرائی سے پیچھے نہ رہے۔ تقسیم ہند کی یہ تاریخی کہانی جس میں حالات و واقعات کے برملا اظہار نے قاری کے ذہن پہ ایک دیرپا نقش چھوڑا، انتقام کی ایک ایسی آگ دکھائی گئی جو بالآخر بدلے کی صورت میں بجھی۔

کماری والا

یہ ناول جہلم بک کارنر لاہور سے 2020ء میں شائع ہوا۔ اس کا انتساب جواں مرگ بھائی اصغر علی اور مقتولہ بہن خدیجہ بی بی کے نام ہے۔ یہ کل 638 صفحات پر مشتمل ہے۔ ''کماری والا'' علی اکبر ناطق کا دوسرا ناول ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی ناول ہے، ناول کی زبان بہت رواں اور اچھی ہے۔ ناول میں مصنف نے کچھ علاقائی الفاظ کا بھی اضافہ کیا ہے۔ جس سے علاقائی مہک کا تاثر ابھرتا ہے، جیسے کہ ٹہلیوں کا ایک نیا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بھلے ہی یہ ایک علاقائی لفظ ہے لیکن ناول نگار نے اس کے ذریعے اردو زبان میں ایک اضافہ کیا ہے۔ منظر نگاری کو بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے اور یہ

کہانی نسلوں پر مبنی کہانی ہے۔ناول میں نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کی عصمت کے کاروبار، ملک کے سیاسی اور بیوروکریٹس اور مذہبی زوال کی عکاسی اور اعلیٰ ترین افسران کے اخلاقی زوال کو بڑی جسارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ناول پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ناطق کو اچھی نثر لکھنے پر کمال حاصل ہے ہر ایک واقعے کو ناطق نے بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے یہ ناول یقیناً اپنے عہد کا ایک قابل ذکر ناول ہے۔عرفان جاوید لکھتے ہیں:

> ''علی اکبر ناطق کے تخلیقی وفور کے سرکش، سرپٹکتے، اچھلتے، چھینٹے اڑاتے دریا نے ''کماری والا'' کی تخلیق کے بعد یک پرسکون، لامتناہی، گہرے، بھید بھرے سمندر کی شکل اختیار کر لی ہے۔اس ناول نے اسے اردو ادب کے چند اعلیٰ ادیبوں میں شامل کر دیا ہے جو مذکورہ لطیف مقام کمال تک جاتی راہ کے قافلے کے مسافر ہیں، وہی مقام جہاں فن پارہ فن کار کی قید سے آزاد ہو کر ضوفشاں ستارہ بن جاتا ہے۔''(17)

کماری والا ناول میں مصنف مذکور نے نولکھی کوٹھی سے مختلف لیکن تاریخی کہانی ہی لکھی ہے۔انہوں نے اپنے بیانیہ اسلوب اور نت نئی تکنیکوں کے ساتھ ایک نئی راہ قائم کی ہے، جو عہد حاضر میں آنے والی نسلوں کے لیے ایک پیغام کی صورت ہے مرد حضرات کو جب کام کے سلسلے میں گھر سے باہر جانا پڑتا ہے تو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔انہوں نے اپنی دانش ورانہ ذہنیت ، ہمہ جہت تجربات اور نہایت چابکدستی سے سماجی پس ماندگیوں کو بے نقاب کیا ہے میرے نزدیک یہ ایک مثبت پہلو ہے۔آنے والی نسلوں کو آگاہ کرنے کیلئے اس ناول کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے اگرچہ ناول میں غیر ضروری طوالت کے باعث قاری اس کو ایک نشست میں نہیں پڑھ سکتا۔مگر ناول ایسا بھی نہیں ہے کہ پڑھتے ہوئے قاری کو محسوس ہی نہ ہو کہ کوئی کہانی نہیں بلکہ بس ایک وقت گزاری کا ساماں ہے ناول پہلو بہ پہلو اپنے اندر ایک نیا تاثر لے کر ابھرتا ہے اور یقیناً یہ مصنف کی تخلیقی کاوش کا ہی نتیجہ ہے۔ناول میں کرداروں کی بات کی جائے تو کہانی کیونکہ نسلوں پر مبنی ہے کہیں زینت، کہیں شیزہ معاشرے کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں اور مرد حضرات میں ضامن جو بچپن سے جوانی تک معاشرے

میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا حالات سے آگاہی رکھنے والا کردار بتایا گیا ہے۔اس کردار کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ہر کسی کی مدد کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔مصنف کی حالات زندگی کے واقعات کو انڈ پینڈینٹ اردو ویب سائٹ پر پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ضامن کا کردار خود مصنف ہی ہیں۔بہر حال ناول ہر طرح سے تاریخی معیار اور سماجی پس ماندگیوں کی عکاسی کرنے میں کامیاب رہا ہے۔مصنف کو نوکھی کوٹھی کی طرح اس میں بھی اچھی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔اپنے ذاتی تجربات کو قلم کی مدد سے صفحات پہ لے آنا کوئی آسان تجربہ نہیں ہوتا لیکن بہر حال اس سب کو انسانی تجربہ بننا ہی پڑتا ہے اور ناول ہمیشہ سے معاشرے کی عکاسی کا منہ بولتا ثبوت رہے ہیں۔

تنقید نگاری

تنقید کے میدان میں بھی مصنف مذکور نے اپنا لوہا منوایا اور ایک کتاب لکھی جس کا نام ''ہیئت شعر'' ہے۔یہ کتاب اقبال کی جمالیاتی ساخت اور ان کی سوچ کے اعتبار سے فکری نام پر بحث کی کتاب ہے۔2016ء میں یہ کتاب اسوہ کالج اسلام آباد سے چھپی اس کتاب کے 224 صفحات ہیں اور اسے 9 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔اقبال کے فن پر یہ کتاب نہایت اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب کے بارے میں ناصر عباس نیر لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک سطح پر ان کی تنقید، اس تخلیقی طریق کار کی وضاحت محسوس ہوتی ہے۔جسے ان کی نظم اور فکشن میں برتا گیا ہے، دوسری سطح پر اقبال کی شاعری کا فنی مطالعہ ایک نئی سطح پر کرتی ہے اور اقبال کی شاعری کو آئیڈیالوجیائی بیانیوں سے آزاد کراتی محسوس ہوتی ہے۔تیسری سطح پر جدید شاعری کی تحسین و تفہیم کا پیمانہ مہیا کرتی ہے۔''(18)

تنقید کے میدان میں بھی مصنف کا پہلا قدم کامیاب رہا اور ان کی کاوش کو سراہا گیا۔اس کتاب میں انہوں نے اقبال کی جمالیاتی ساخت اور ان کی شاعری کا ان کی سوچ کے اعتبار سے فکری جائزہ پیش کیا ہے۔انہوں نے ایک نئی سطح پر اقبال کی شاعری کا جائزہ پیش کر کے اسے قابل تحسین کے پیمانہ سے متعارف کروایا ہے۔یقیناً یہ ناطق کے فن کی ایک عمدہ کاوش ہے۔

انڈ پینڈنٹ اردو ویب سائٹ

اپنی ذاتی تسکین کے لیے جب انسان کے اندر بے شمار وسیع اور لامتناہی خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے تو اکثر وہ مختلف سائٹس پر خیالات کا اظہار کرتا ہے۔مصنف نے بھی اپنے خیالات کا اظہار اپنی ذاتیات اور حالات زندگی کو ''میری کہانی'' پر کہانیاں لکھ کر بیان کیا ہے۔ان کا انداز بیان نرالا اور نہایت دلچسپ ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مصنف کو ایک کے بعد ایک خیال آتا گیا تو وہ اسے لکھتے ہی گئے کیونکہ انڈ پینڈنٹ اردو سائٹ پر ان کے خیالات کا انبار لگا ہے۔انہوں نے اپنی زندگی کی کئی کہانیاں بیان کی ہیں جن میں بچپن کے واقعات سے لے کر جوانی تک کے تمام قصے،ملازمت،تعلیمی سرگرمیاں،سفر نامے،اسفار ،بچپن کے واقعات اور اس کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

1۔ شاہیا پہلوان: زمین کھا گئی پہلوان کیسے کیسے
2۔ بینڈ پروفیسر اور بلداتی گدھا
3۔ عجائب گھر کے ڈھانچے کا بگ بینگ
4۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو شاعر کی بجائے چور ہوتے
5۔ جاٹوں کو مفت گڑ اور دل بیرحم
6۔ عربی گدھے کھجوریں اور میں
7۔ جب لوگ ہماری لاش ڈھونڈنے نکلے
8۔ جب ہم پھنسے گلیڈی ایڑوں کے چنگل میں
9۔ جب ہم نے ننگ دھڑک بارات نکالی
10۔ جب میاں صاحب نے گورکن پر سانپ سے حملہ کیا
11۔ جب میرا کوٹ مارشل ہوتے ہوتے بچا
12۔ جب اچھوتے پدم ناگ سے مقابلہ کیا
13۔ جب بکرا بابا جی کا کشتہ کھا گیا

14۔ جب دادا جی ہمارے تیروں کا شکار بنے
15۔ بھارت میں ہم پر کیا بیتی
16۔ جب ہم کشمیر فتح کرتے کرتے بچے
17۔ جب ہم بھیڑیوں کی خوراک بنتے بنتے بچے
18۔ جب ہم طوائف محلے میں گھیر لیے گئے
19۔ کوفہ میں زمانوں کا مسافر
20۔ مراثی کا مرغا اور حج کا ثواب
21۔ نجام الدین کی بستی اور پیسوں کا غلہ
22۔ ابن بطوطہ امریکہ کو روانہ
23۔ ہائے حاتم طائی کی ہفت پر رہ گئی
24۔ مجھے قتل ہونا پسند نہیں اس لیے پاکستان نہیں آتا جونرہ بھٹو
25۔ بابا جی کے بھوت
26۔ ملک شرافت خاں کے بھیڑیے اور اماں صالحہ
27۔ ایک الف لیلوی سانپ اور بابا مہندہ
28۔ فہک ہماری سائیکل کے چوری ہونے کا
29۔ ایسے ٹوٹ کر برسے اولے پشتیں ہو گئیں لال

ان تمام کہانیوں میں مصنف کی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔عمدہ انداز بیان ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم کوئی افسانہ پڑھ رہے ہوں۔جس طرح سے انہوں نے ان میں اپنی زندگی کے بارے میں لکھا ہے ان کی عادات وخصائل رہن سہن اور طرز معاشرت کا عکس نظر آتا ہے۔

جہاں ان کہانیوں میں اپنی حالات زندگی بیان کی ہے وہاں انہوں نے امریکی معاشرت پر بھی کہانیاں لکھی ہیں، اپنے اسفار کا تذکرہ کیا ہے، انڈیا کی سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ہمیں دکھایا ہے۔ لاہور کے علاقے کی مکمل تصویر بنائی ہے، کہانی کے ذریعے جو اپنی الگ ثقافت کی ایک مکمل

تاریخ ہے، پاکستانی فلم انڈسٹری کو بھی بہت دلچسپی کے ساتھ دکھایا ہے، عرب کی سماجی زندگی کی داستان بیان کی ہے اور کچھ کہانیوں میں علاقائی انداز تحریر کو اپنایا ہے۔

یہ تمام کہانیاں صرف ادبی لحاظ سے ہی اہمیت کی حامل نہیں ہیں بلکہ ان کہانیوں میں بیشمار دوسری ثقافتوں اور دوسرے ممالک کے رہن سہن سماجی نظام کی جھلک نظر آتی ہے۔ ذہن پڑھتے ہوئے دنگ رہ جاتا ہے کہ ان کے ذہن میں بے شمار خیالات کیسے آئے کیا وہ ایسی زندگی پہلے گزار چکے ہیں۔ کیا وہ معاشرے کے مسائل کو خود محسوس کر چکے ہیں۔ ہر کہانی میں ایسا رنگ دکھایا گیا ہے جسے پڑھ کر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

درعدالت علے

''درعدالت علے'' علی اکبر ناطق کی مناقب اہل بیت کا مجموعہ ہے۔ مولا کی طرف سے خاص عطا کیا ہوا۔ ان کے کلام نے مولا علی کے قصائد آئمہ طاہرین کے حضور نذرانے کے طور پر کلام پیش کیا ہے۔ قاری جب پڑھتا ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ مصنف نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ انہوں نے اس میں تاریخِ حق کو بیان کیا ہے کہ کس طرح تاریخِ حق کو منقبت میں سمو دیا گیا ہے۔ درعدالت علے عکس پبلی کیشنز نے 2020ء میں شائع کی۔ اس کا انتساب سید اظہر علی عابد کے نام ہے۔ اس کتاب نے مذہبی اور ادبی حلقوں میں یکساں طور پر ارتعاش پیدا کیا ہے۔ انہوں نے اس میں ایک نظم ''یا علی میں گداؤں کی بستی کا ساکن'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ جس سے ان کا علی سے عشق کی انتہا کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ نظم انسان کے دل و دماغ کی پاکیزگی اور اس کے کردار کو بلندی کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک دن وہ اسلام آباد میں تھے۔ ظہور امام کے دن تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ سید منظر نقوی کے ساتھ جامعہ صادق جی نائن اسلام آباد میں مجلس سننے کے واسطے پہنچا۔ سید اظہر نے جیسے ہی مجھے قریب پایا تو مجھے سلام پڑھنے کیلئے کہہ دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ کلام پاس نہیں تھا اور لکھا ہوا کچھ یاد نہیں تھا۔ خیر قدم اٹھتے چلے گئے اور ایک نظم جو اسلامک کو ذہن میں رکھ کر لکھی تھی اسی کے شعر پڑھنے لگے ناطق بتاتے ہیں کہ انھیں خوب داد وصول ہوئی۔

پھر انہوں نے ان کی مدح کے لیے بھی قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا اور لکھتے ہی چلے گئے۔ اس

طرح انھوں نے درعدالت علے کو مکمل کیا۔اس کا انتساب اسی لیے اظہر علی عابدی کے نام ہے کیونکہ وہ اپنی اس کتاب کے لکھنے کے پیچھے وجہ ان کو گردانتے ہیں۔اظہر علی عابدی درعدالت علے کے بارے میں لکھتے ہیں :

''ان کے کلام میں مودت اہل بیت کی روح پرور مہک بھی ہے اور دشمنان اہل بیت کی بدکرداریوں سے نفرت کا تذکرہ بھی۔تاریخ کی گواہیاں بھی ہیں اور محبان اہل بیت کی لازوال قربانیوں اورحق وانصاف کے لیے ان کی نورانی جدوجہد کا ذکر بھی۔گویا عشق ومودت اورعلم وعمل کا ایک نورانی تار ہے جو ناطق نے باندھا ہے۔''(19)

ناطق کی مدحیہ شاعری کا مجموعہ یقیناً نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ مدح سرائی میں بھی ایک قیمتی سرمایہ واضافہ ہوگا۔محبانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآلِ محمد اس مجموعے کو نہایت دل واحترام اور چاہت سے پڑھیں گے۔جہاں سے ناطق نے ابتدا کی اس کی وہ ایک سلام پڑھنے کی بات تھی پھر جب ناطق نے کتاب لکھی تو سلام کے اشعار بھی لکھے ملاحظہ ہو۔

ناز کرتا ہے صلیبوں کی بلندی پہ تمار
کاٹ لیتے ہیں زباں اس کی ہوا کے بندے
(20)

اس شعر سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ قاری پہ یہ کتاب کیسے سحر اور سرور کی کیفیت چھوڑ دیتی ہوگی۔ایک ایسا تاثر جس سے قاری بیک وقت خود کو ماضی کے دریچوں کی طرف جاتا ہوا محسوس کرتا ہے اور ایک ایک کر کے تمام واقعات سے لطف اندوز ہوتا ہے یہ کتاب ناطق کے عشق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سیاسی نظریہ

ناطق کیونکہ تاریخ کے آدمی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ تاریخ ہمیں دانش دیتی ہے۔اس لیے تاریخی رنگ ان میں نمایاں نظر آتا ہے۔ان کی شاعری اور نثر دونوں میں تاریخی رنگ پایا جاتا ہے۔عام طور پر شاعری میں اور خصوصاً غزل میں تاریخ کا پایا جانا کسی شاعر کے ہاں بہت کم دیکھا

گیا ہے لیکن ناطق نے شاعری میں خصوصاً اپنی غزلیات میں تاریخ کو شامل حال رکھا ہے، سیاست کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں بھی سیاست کو موضوع بنایا ہے۔

ناطق نے چونکہ بہت اسفار کیے ہیں اس لیے وہ ملکی وغیر ملکی ثقافت کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ان کی نظموں میں بھی ملکی وغیر ملکی سیاست کا ذکر ملتا ہے۔اس سے پہلے دیکھا جائے تو شاعروں نے سیاست میں مارشل لا اور سیاسی اتار چڑھاؤ کو موضوع بنایا ہے جمہوریت اور آمریت پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔لیکن انہوں نے ملکی وغیر ملکی سیاست پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ان کی مختلف نظمیں ایسی ہیں مثلاً ''نام ونسب''غلام قوم کا دانشور، ہجرت ،شہر کا ماتم اور خاص طور پر سفیر لیلی جسے کافی شہرت حاصل ہوئی۔ان تمام نظموں میں انہوں نے سیاسی نظریہ کو مدنظر رکھا ہے۔

وہ لکھتے ہوئے جس شہر یا علاقے میں جو زبان جس حوالے سے استعمال ہوتی ہے، اسی زبان کو اپنی لکھاوٹ کا حصہ بناتے ہیں۔ناطق ایک تاریخی قصے کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ نواب سراج الدولہ جب اس کا دور حکومت تھا تو اس کا کہنا تھا کہ پیسا صرف نواب کے پاس ہوا گر کسی اور کے پاس دیکھا جائے تو اسے جیل میں بند کر دیا جائے۔پھر میر جعفر کی بات کرتے ہیں کہ جو چاہتا تھا کہ بنگال کی ترقی ہو جائیتو وہ کیا کرتا کہ نواب چاہتا تھا کہ پیسہ صرف اس کے پاس ہو اور کسی کے پاس نہ ہو پھر وہ کہتے ہیں کہ انگریز آئے تو انگریزوں نے کہا کہ اگر آپ سو روپیہ کماتے ہو تو بیس تو اپنے ملک پہ لگا لو۔

وہ ان باتوں کا اظہار اس لیے کر رہے تھے کہ ان کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی فلاسفر پیدا نہیں ہوا۔کسی کو تاریخ پڑھنے کی عادت ہی نہیں ہے کہ کچھ سیکھ ہی لیں۔تو ان کا کہنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں پانچ سال کے اندر اندر برطانیہ مفلس ترین ہو گیا مگر وہ مفلس ترین نہیں رہا۔یہ خود کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ کس طرح ترقی کرنی ہے اور کس طرح قوم کو زبوں حالی سے نکالنا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ نچلے طبقے کو ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے انھیں اپنا اقتدار حاصل اور برقرار رکھنے کیلئے ہی بس استعمال کیا جاتا ہے اور وہ بے بس ہیں کہ نچلے طبقے میں طاقت نہیں ہے۔وہ یہ سب باتیں اپنے ناول نولکھی کوٹھی کی وجہ سے کر رہے ہیں کہ ولیم کا کردار جو کہ ایک انگریز تھا اور اس کا دل نرم رکھا جو چاہتا تھا کہ دونوں قوموں کا بھلا

ہوجائے مگر ان دونوں قوموں میں آپس کا انتشار اور آپس کی دشمنیاں ہی ان کو لے ڈوبی۔ان کا کہنا ہے کبیر صغیر کا مسئلہ ہے کہ یہ ذہنی غلام ہیں۔بس انہی سب باتوں کو وہ ذہن میں رکھے کہ وہ برصغیر پاک وہند سے خائف تھے اس لیے انھوں نے نولکھی کوٹھی ناول لکھا جو قارئین نے کافی پسند کیا۔انہوں نے اپنی نظموں میں بھی جو سیاسی رنگ دکھایا ہے وہ بھی کمال کا ہے۔ان کی نظم ''شہر کا ماتم'' ملاحظہ ہو:

اس بار چلیں گی سرد ہوائیں نیل بھری
سانواں کا ملبہ بار کرے گا سینوں پر
اور دل کے پیارے رک جائیں گے زمینوں پر
سنسان گھروں میں رقص کریں گی دوپہریں
ویران چھتوں پر رات اکھاڑ ڈالے گی
زہر در و دیوار کے ڈھانچے کھا جائے گا
شہر کا ماتم کرنے والا کون بچے گا
خون کے آنسو رونے والا کون رہے گا (21)

اس نظم میں انہوں نے تاریخ میں ہونے والے برصغیر تقسیم ہند کے بعد کے واقعات جن میں وہ بہت عقیدت بھرے انداز میں اظہار غم کر رہے ہیں۔نظم شہر کا ماتم کہ جہاں ایک دنیا بستی تھی اجڑ گئی جہاں رونقیں تھیں ماتم میں بدل گئی۔سب کا سب ایک ہی آن میں ختم ہو گیا اور شہر ماتم میں بدل گیا۔شہر کی خاموشی سے مراد ہے کہ وہ لوگ جو بچ گئے ہیں وہ بھی زندہ لاش کی طرح ہیں۔اپنے پیاروں سے بچھڑ جانے کے غم میں،ان پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کے غم میں کہ اب ماتم کرنے والا بھی کوئی نہیں بچا کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بہت ہی گہرائی میں جا کر اس نظم کو لکھا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ماتم کی صورت میں شہر کو دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔اس تقسیم نے بہت گھروں کو دلوں کو خوشیوں سے اجاڑ دیا اور اب سارا شہر ماتم کر رہا ہے۔اپنے افسانوں میں بھی وہ سیاسی رنگ کی جھلک دکھاتے ہیں۔ان کا افسانہ ''زیارت کا کمرہ'' جو بغیر کسی تامل کے دنیا کے بڑے افسانوں کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔اس افسانہ میں مصنف مذکور نے ملک عزیز میں پیدا ہونے والی فرقہ بندی کو موضوع بنایا ہیکہ یہ کہاں کہاں

اور کس حد تک اپنے پنجے گاڑ چکی ہے۔ بہت ہی ہمت کے ساتھ مصنف نے اس میں اپنی تخلیقی کاوش کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ نہ صرف ڈھکے چھپے لفظوں میں بلکہ بعض اوقات نہایت بے باکی سے سب بیان کر جاتے ہیں۔ جیسے ان کے افسانے سیاہ ٹھپا، تمغہ اور والٹر کا دوست میں سیاسی صورت حال کو علاقائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ تمغہ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جنگلات اس لیے بھی زیادہ تھے کہ تمام علاقہ رینجرز کی حدود میں تھا اور وہ درخت کاٹنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہاں ہزاروں زمیندار تھے اور سب نے غنڈے پال رکھے تھے یہ غنڈے پورے علاقے میں مجرمانہ کاروائیاں کرنے کے بعد ان زمین داروں کے پاس پناہ لے لیتے۔ کسی زمین دار کو مخالف سے نپٹنا ہوتا تو اپنے غنڈے سے یہی دو دو ہاتھ کرتا۔ گویا غنڈوں کو پناہ دینا زمین داروں کی بقا کا مسئلہ تھا۔ میں کم و بیش سب زمین داروں اور ان کے متعلقہ غنڈوں سے واقف تھا لیکن اپنی مرضی سے کاروائی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ویسے بھی میرا منصب ایک حوالدار کی حیثیت سے بڑے کاموں میں دخل دینا یا تھانے کی پالیسی وضع کرنا نہیں تھا۔ تھانے دار کو اس کا مطلوبہ حصہ وقت پر پہنچ جاتا چنانچہ پولیس اپنا اثر رسوخ عموماً شہر حدود میں برقرار رکھتی۔ گویا پولیس زمینداروں اور غنڈوں کے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا۔''(22)

انہوں نے افسانوں میں بھی حقیقت نگاری کو شامل حال رکھا ہے۔ وہ اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ افسانہ تمغہ میں جو سیاسی رنگ انھوں نے پیش کیا ہے اس کے مطابق عوام بالکل بے بس ہے کیونکہ سب قوانین زمینداروں اور غنڈوں یہاں تک کے خود پولیس کے ہی ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ جن کو وہ اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔ خیالات کا یہ اظہار ناطق کے حقیقت پسند ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

مذہبی نظریہ

مذہبی نظریے کے حوالے سے وہ مذہب کو لے کر ڈٹ جانے والے انسان ہیں ان کی شاعری میں مذہبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔خصوصاً غزلوں میں ان کے بیشمار اشعار مذہبی تناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔وہ تلمیحات کو استعمال کرتے ہیں، مذہبی عنصر کو تشبیہات اور استعارات کی مدد سے نمایاں کرتے ہیں، ان کی ذاتی زندگی ہو، معاشرتی زندگی ہو یا پھر زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو، وہ مذہب کو اہمیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کہیں وہ مذہب پر طنز کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں مذہب کی تاریخ بتاتے نظر آتے ہیں اور کہیں واقعہ کی صورت میں مذہبی داستان سنانے کی جسارت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مسلمانوں کے تاریخی مذہبی عقائد وواقعات کو بھی ناطق نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔آب زم زم کا چشمہ پھوٹنے کا پورا واقعہ انہوں نے اپنی غزلوں میں مذہبی عقائد کی نمائندگی کرتے ہوئے سنایا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں بھی مذہبی عنصر کو عروج پہ رکھا ہے۔ان کی نظمیں، جن میں مذہبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے، درج ذیل ہیں: ''عصا بیچنے والا، سفیر لیلیٰ، کلیسا، مدفن، مدینے کا قصہ، سلام وغیرہ وغیرہ ان تمام نظموں میں مذہبی رنگ نمایاں پایا جاتا ہے۔ناطق کی نظم مدینے کا قصہ سے کچھ حصہ ملاحظہ کیجیئے:

''علی بن محمد تمہیں یاد ہوگا مدینے کا قصہ
یہی وہ مدینہ، جسے اس کے بانی نے شہر محبت کہا تھا
یہاں اک شریفوں کا گھر
ہل اتی ان کا ورثہ
شریفوں کا گھر تھا خدا کی طرف سے زمانے پہ آیت''(23)

اس نظم میں وہ مذہب کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مدینے کا قصہ سنا رہے ہیں اور نبی پاک ﷺ کے گھرانے کی بات کر رہے ہیں۔مذہبی نظریہ کی بات کریں تو انہوں نے اپنے ناول نولکھی کوٹھی میں اس کا صحیح رنگ دکھایا ہے۔''مولوی کرامت'' کے کردار کی مدد سے معاشرے میں ایسا مولوی طبقہ بھی ہے، جو مذہبی پیشواؤں کو نشانہ بناتے ہیں اور اپنی ترقی کی خاطر انگریز حکومت کے تلوے چاٹتے ہیں، اس سے پہلے تک وہ اپنے عہدے کو سمجھ ہی نہ پائے تھے۔انہوں نے افسانوں

میں بھی تابوت، کمی بھائی، زیارت کا کمرہ اور حاجی ابراہیم میں مذہب کو موضوع بنایا ہے۔ان کے مطابق دینی پیشوا اور مولوی مذاہب کا غلط استعمال کرتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔راقمہ نے ادبی پہچان کے حوالے سے جب ناطق سے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ابتدا شاعری سے کی تھی اور شاعری ہی میری اصل پہچان ہے۔اگر کوئی مجھے شاعری اور نثر میں کسی ایک کو چھوڑنے کو کہے تو میں شاعری کو کبھی بھی ترک نہیں کروں گا۔موجودہ شاعری اور نثر کے حوالے سے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے کہ موجودہ شاعری اور نثر کے حوالے سے وہ شاعری میں زیادہ عروج دیکھتے ہیں اور اس حوالے سے انھیں اطمینان بھی ہے یعنی وہ نثر کی نسبت شاعری میں زیادہ شاعروں کو کامیاب دیکھتے ہیں۔

ناطق کے حوالے سے مختلف ادیبوں کی رائے:

ناطق نے عصری ادب میں بہت ہی کم وقت میں شہرت کے زینوں کو پار کیا ہے۔اس بات کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ انھوں نے عصری ادب میں صرف ایک صنف یا جہت میں نہیں بلکہ شاعری، افسانہ، ناول، مرقع نگاری، کالم نگار یا ور تنقید ہر میدان میں اپنا ہنر آزمایا ہے۔بڑے بڑے نقاد اور ادیب ناطق کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔

منظر نقوی تنقید کے میدان کے شہسوار ہیں۔اسلوبیات ان کا پسندیدہ موضوع ہیں لیکن وہ غضب کا شعری ذوق رکھتے ہیں۔منظر نقوی کا قلمی سرمایہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے نثر اور نظم دونوں کے میدان میں کام کیا ہے۔منظر نقوی لکھتے ہیں کہ:

> ''نولکھی کوٹھی''، علی اکبر ناطق کا پہلا ناول ہے۔اس ناول نے ثابت کیا ہے کہ کلاسیک ادب کیسے لکھا جاتا ہے۔'نولکھی کوٹھی'' نے آنے والے وقتوں کیلئے نہ صرف ادب کے معیار کو طے کیا ہے بلکہ ہندوستان میں انگریز راج اور پنجاب کے کلچر کو مکمل طور پر ایک نئے، مختلف اور روایتی انداز سے ہٹ کر پیش کیا ہے۔اس ناول نے ادب میں ایک نئی تاریخ رقم کر دی ہے۔''(24)

منظر نقوی کی یہ رائے ناطق کا ناول پڑھنے کے بعد بالکل درست ثابت ہوتی ہے کیونکہ ناطق نے کلاسیک ادب کے معیار کو ناول میں برقرار رکھا ہے اور نولکھی کوٹھی کے ذریعے انھوں نے ادب کے معیار کی ایک نئی رائے قائم کی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ پاکستان کے مشہور سفر نگار، ڈرامہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ان کی وجہ شہرت ان کے سفر نامے اور ناول ہیں۔ادیب ہونے کے علاوہ وہ فن اداکاری سے بھی وابستہ رہے اور پاکستان کے ان ادیبوں میں سے ہیں جنہیں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ناطق کے افسانوی مجموعے پران کی رائے کچھ یوں ہے:

> ''علی اکبر ناطق ایک عجیب سالاابالی نوجوان ہے جس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اگلے لمحے آپ کا دشمن ہوجائے یا فوراً ہی آپ کو گلے لگالے لیکن یہ طے ہے کہ افسانے، ناول یا شاعری میں اس کی صلاحیتیں بلاخیز ہیں۔اس کا افسانوی مجموعہ ''شاہ محمد کا ٹانگہ'' ایسا ہے کہ اردو ادب کا ایک سراسر نیا روپ اس میں سواری کرتا نظر آتا ہے'' (25)

مستنصر کی رائے کے مطابق ناطق کے فن میں واقعی ایسے ہی عناصر پائے جاتے ہیں کہ وہ ہر پل ایک نئی اڑان بھرتے نظر آتے ہیں۔وہ کب، کہاں اور کس وقت ایک نئی فتح حاصل کرلیں کوئی نہیں جانتا۔

فہمیدہ ریاض پاکستان کی نامور ادیبہ، شاعرہ اور حقوق انسانی اور حوق نسواں کیلئے کام کرنے والی سرگرم رکن ہیں۔وہ لکھتی ہیں کہ:

> ''بہت کم وقت میں ادب کا یہ نووارد اہر واہل ذوق کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔دیکھیے گا کہ آپ کو نظر نہ لگے، دوسروں کی بھی اور اپنی بھی۔دوسروں کی اس لیے کہ ایسی پذیرائی دوسروں کو کہیں برسوں میں جا کر نصیب ہوتی ہے اور اپنی بھی اس لیے۔۔ہم جیسے تھکے ہارے مسافروں سے پوچھو؛ قلم کا سفر کاغذ پر طویل ہوتا ہے اور کسی بھی موڑ پر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ منزل تو ابھی بہت دور ہے۔(26)

ناطق کو نظر نہ لگنے کی رائے اس لئے دے رہی ہیں کہ یہ خود ان میں سے ہیں جن کو مختلف انداز بیان پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔اردو ادب میں اپنی الگ پہچان رکھنے والے عرفان جاوید نے نہایت مختصر عرصے میں یہ مقام حاصل کیا۔آپ کو یہ پہچان صف اول کا خاکہ نگار ہونے کی حیثیت سے ملی۔عرفان جاوید ناطق کی ذات کو طوفان سے تشبیہ دیتے ہیں جو ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھ سکتا۔عرفان جاوید کہتے ہیں:

> ''اگر اس کی ذات کی زرخیزی اور وفور کو ادب کی راہ نہ ملتی تو نہ جانے یہ طوفان بلا کدھر کا رخ کرتا،تخریب کرتا یا تعمیر کرتا،کرتا ضرور کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا نہ رہتا۔اگر اس سے پوچھا جائے کہ وہ کیا پسند کرے گا کہ آنے والے اسے کیسے یاد رکھیں، بطور ادیب یا شاعر،تو اغلب امکان ہے کہ وہ بول اٹھے گا۔''غلام علی'' یہ ہمہ صفر،متلون مزاج،سیمابی، پارہ نما آدمی اس دور میں اپنی طرز کا واحد آدمی ہے،ایک انوکھا شخص!''(27)

ناطق نے اپنے تخلیقی سفر میں دو ناول،دو افسانہ نگاری کے مجموعے،تین نظموں اور دو غزلوں پر مشتمل کتب،ایک مجموعہ کلیات جس میں تمام نظموں کی کتب اپنے دیباچے کے ساتھ شامل ہیں۔اس کے علاوہ حال ہی میں ان کی ایک کتاب شائع ہوئی ''سفیر لیلیٰ'' کے نام سے جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ایک کتاب تنقید مرقع ساز یا ور ایک درعدالت علے کے نام سے منقبت لکھی آپ نے بے شمار کہانیاں اردو انڈپینڈینٹ سائٹ پر بھی لکھی۔اپنی اس ادبی تخلیقات سے آپ نے نہایت کم عرصے میں مقبولیت سمیٹی۔لوگوں کے دلوں میں گھر کیا،کمی کوتاہی اور زندگی کے مشکل ترین دنوں کو فن میں ڈھال کر لکھا ہر صنف میں قسمت کو آزمایا۔یہ تخلیق کار کی بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ اسے کامیابی ملتی جائے اور ان کو اپنے پہلے ہی افسانوی مجموعے پر یوبی ایل ایوارڈ بھی ملا جو ان کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ناطق کے چرچے غیر ملکی اخباروں میں بھی رہے۔بڑے بڑے افسانہ نگار نے کالم نگاروں نے ان کے فن پر تبصرے کیے اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔جس کا انہوں نے خوش دلی سے استقبال کیا اور

اپنے فن مزید کو نکھارا۔ گرانٹا جیسے بڑے ادارے میں ان کے پہلے ناول ''نولکھی کوٹھی'' کا ترجمہ ہوا، اس کے علاوہ مزید دوسری زبانوں میں ان کے افسانوں اور ناولوں کے تراجم ہوتے رہے اور شائع بھی ہوتے رہے ہیں۔ پینگوئن سے ان کی کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ملکی و غیر ملکی سفر کے دوران کئی ادبی پروگرامز میں حصہ لے چکے ہیں۔ وہ ''پختہ''، ''فیض میلہ'' اور اس کے علاوہ ''غالب انسٹیٹیوٹ پروگرامز'' میں بھی حصہ لے چکے ہیں۔ نیو یارک یونیورسٹی میں اردو شاعری کے حوالے سے پروگرام میں شرکت کی اور انڈین پروگرامز کی صدارت بھی کر چکے ہیں۔ ''مارک کانفرنس'' کے پروگرام میں وہ بطور چیف گیسٹ شامل رہے، وسکالسٹن یونیورسٹی میں انہوں نے ادب پر لیکچر دیے، افسانے پر بات کی اور ادب کی زندگی میں اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے ہر دو اصناف میں اپنی مہارت دکھائی ہے ناطق دور حاضر کے ایک مشہور و معروف ادیب ہیں۔

انہوں نے نہ صرف شاعری، بلکہ نثر نگاری میں بھی شہرت حاصل کی۔ وہ سماج میں موجود حقائق اور مسائل کو سامنے لے کر آتے ہیں اور اہم موضوعات پر قلم اٹھا کر نہایت دلیری سے سادہ اور عام فہم انداز میں حقائق پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک منفرد اور سادہ انداز نگارش رکھنے والے قلم کار ہیں۔ ہر طبقے سے جڑے ہوئے مسائل و معاملات کا گہرا فہم رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔

وہ خاندانی روایات کی پاسداری، اخلاقی اقدار، اعلیٰ طبقے کے مسائل، متوسط طبقے کی خستہ حالی، دولت کے حرص و لالچ، الغرض تمام سیاسی، سماجی معاشرتی اور مذہبی مسائل پر قلم اٹھا کر اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ اردو ادب میں جو چیز ناول کو داستان سے الگ کرتی ہے، اس میں حقیقت کا بیان، کرداروں کی اہمیت اور ایک مقصد کی گہرائی ہے کیونکہ ناول کا تعلق حقیقت سے ہے اور اس میں ہمیں اپنی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور ناطق کے ناولوں میں قاری اپنی زندگی سے جڑے تمام مسائل کو رواں نثر کی صورت میں پڑھتا ہے اور خود کو کہانی کا حصہ سمجھتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ حیدر تصنیف برقی انٹرویو بازگشت۔کام 2020ء ساعت 3:57
2۔ حیدر تصنیف برقی انٹرویو بازگشت۔کام 2020ء ساعت 00:4
3۔ ناطق علی اکبر، بے یقین بستیوں میں، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، 2010 ص 25
4۔ ریاض فہمیدہ، بے یقین بستیوں میں، دیباچہ، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، ء2019
5۔ ناطق علی اکبر، یاقوت کے ورق، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، 2019ء، ص 39
6۔ سید، زیف، سرمنڈل کا راجہ، پیش لفظ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2014ء، ص 10
7۔ ریاض فہمیدہ، دیباچہ، بے یقین بستیوں میں، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، 2010ء
8۔ فاروقی شمس الرحمن دیباچہ، سبز بستیوں کے غزال، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2018ء
9۔ ناطق علی اکبر، سبز بستیوں کے غزال، پیش لفظ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور 2018 ص 11
10۔ ناطق علی اکبر، سبز بستیوں کے غزال، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور 2018ء ※ ص 29
11۔ راٹھور، ارسلان احمد مضمون، سبز بستیوں کے غزال، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2018ء، ص 81، 82
12۔ ناطق علی اکبر، سفیر لیلی کلیات، جہلم بک کارنر، جہلم، 2022ء، ص 403
13۔ اقبال ظفر، روزنامہ دنیا، دال دلیہ، تاریخ اشاعت 27۔11۔2017ء
14۔ ناطق علی اکبر، قائم دین (افسانے) پیش لفظ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2018ء، ص 5
15۔ نقوی شہناز، (26 جون 2019ء) مضمون، علی اکبر ناطق
16۔ منہاس، امجد سلیم، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، جہلم، 2019ء (بیک فلیپ)
17۔ جاوید، عرفان، کماری والا، جہلم بک کارنر، لاہور، 2020ء (بیک فلیپ)
18۔ نیّر، ناصر عباس، ہیت شعر، اُسوہ کالج اسلام آباد، ص (بیک فلیپ)
19۔ عابدی، اطہر علی، درعدالت علے، پیش لفظ، عکس پبلی کیشنز، لاہور 2020ء
20۔ ناطق علی اکبر، درعدالت علے، عکس پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء، ص 22
21۔ ناطق علی اکبر، یاقوت کے ورق، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، 2013ء، ص 14
22۔ ناطق علی اکبر، شاہ محمد کا ٹانگہ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء

23۔ ناطق،علی اکبر، یاقوت کے ورق،سٹی پریس بک شاپ،کراچی،2013ء،ص60
24۔ تقوی منظر،نولکھی کوٹھی،جہلم بک کارنر،جہلم،2020(بیک فلیپ)
25۔ تارڑ،مستنصر حسین،نولکھی کوٹھی،جہلم بک کارنر،جہلم،2020(بیک فلیپ)
26۔ ریاض فہمیدہ، یاقوت کے ورق، دیباچہ،سٹی پریس بک شاپ،کراچی،2013ء※
27۔ جاوید،عرفان،کماری والا،جہلم بک کارنر،جہلم،2020ء※ (بیک فلیپ)

☆☆☆☆☆☆☆

اردو ناول میں پسماندگی کے مظاہر

ایک مکمل کہانی جو تمام اجزائے ترکیبی کے ساتھ بیان کی جاتی ہے ناول کہلاتی ہے۔یہ وہ صنف سخن ہے جس میں جذبات،خیالات، واقعات اور ثقافت کو حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ناول معاشرے میں نسل در نسل چلنے والی کہانیوں کا عکاس ہے کیونکہ یہ ایک طویل کہانی ہوتا ہے اس لیے معاشرے کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔

ادبی اصطلاح میں دیکھا جائے تو ناول سے مراد ایک ایسی کہانی ہے جس میں پوری زندگی بیان کی جاتی ہے۔ناول ادب کی ایک صنف ہے لغت میں ناول کے معنیٰ ''نادر'' نئی بات یا نئی چیز کے ہیں۔یہ اطالوی زبان کے لفظ ''ناولا'' سے نکلا ہے ناول کے، معنی بھی ''نیا'' کے ہیں۔

معاشی،مذہبی،سیاسی،سماجی،نفسیاتی چاہے زندگی کا کوئی بھی موڑ ہو ناول میں ہر پہلو کو کھل کر بیان کیا جاسکتا ہے۔قدیم زمانے میں داستان کا عروج تھا اور زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ عصر جدید میں ادب کی نئی صورتیں سامنے آئیں۔ناول داستان کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے۔

دوسرے اصناف ادب کی نسبت اردو ناول کی عمر کم ہے۔مگر ناول نے اپنا راستہ طے کرتے ہوئے منزل کو پالیا۔طویل داستان جس کے لیے نشستیں درکار ہوتی ہیں اس میں تبدیلیاں کرنے کے بعد مختصر کیا گیا اور ناول کا نام دیا گیا۔اردو ناول عروج وزوال کی منزلیں طے کرتا ہوا عصر حاضر میں جدید ناول کی طرف گامزن ہے۔

ناول دراصل عصر حاضر میں اس زمانے اور معاشرے کی سچی تصویر پیش کر رہا ہے بہر کیف ناول کے تمام عناصر کو نہایت ہی خوبصورتی اور ہم آہنگی، تخلیقی وفنی دلکشی، توازن اور فن کارانہ سلیقہ مندی کے ساتھ منظر عام پر لے آنا ہی ناول نگار کے لیے کامیابی کی دلیل ہے اور یہ فن صبر و ریاضت اور تخلیقی بصارت دونوں کا ہمیشہ ہی سے طالب ہے۔ عظیم الشان صدیقی کے مطابق:

> ''ناول اور داستان میں ان تضادات کے باوجود بیان واقعہ، افراد قصہ، ماحول اور اظہار بیان کی ایسی فنی مماثلتیں بھی موجود ہیں جنہیں قصہ کے اجزائے ترکیبی میں ہمیشہ بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ البتہ ناول میں ان عناصر کی توسیع شدہ اور نکھری ہوئی شکل پائی جاتی ہے۔''(1)

ناول کی یہ تعریف کہ اس میں جذبات، خیالات، ثقافت اور واقعات کو کھل کر بیان کیا جاتا ہے غلط نہیں ہے کیونکہ ناول معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ عصر حاضر میں ناول اپنی جدید ترین شکل کی طرف رواں دواں ہے۔ کیونکہ ناول میں تمام عناصر کی نکھری ہوئی شکل پائی جاتی ہے۔

ناول کے عناصر ترکیبی:

ناول ادب کی ایک صنف ہے۔ ناول اور داستان میں نمایاں فرق ہے ایسی مخصوص خصوصیات جو ناول کو داستان سے ممتاز کرتی ہیں وہ حقیقت نگاری، فلسفیانہ گہرائی اور کردار کی اہمیت ہے۔ جہاں تک حقیقت نگاری کی بات ہے تو حقیقت نگاری داستان میں بھی پائی جاتی ہے اور اسی طرح ناول بھی تخیل سے محفوظ نہیں ہے اس میں بھی تخیلاتی تصورات پائے جاتے ہیں۔ جس طرح داستان میں طویل قصے اور بے شمار کردار پائے جاتے ہیں اسی طرح ناول میں مختصر واقعات کے ساتھ ساتھ کرداروں کی بھرمار سیکنارہ کیا جاتا ہے۔ داستان میں کہانی کا صرف ایک رخ سامنے آتا ہے اس کے برعکس ناول سوچ وتصور کی باز یافت یا ممکن حد تک ترتیب وتشکیل کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جہاں داستان میں مافوق الفطرت کردار پائے جاتے ہیں خارجی رشتوں جبکہ ناول میں خارجی کے ساتھ ساتھ باطنی حقیقتوں کا بھی گہرائی سے فلسفیانہ تکنیک کو مدنظر رکھتے ہوئے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ناول میں کچھ خاص عناصر مقرر

کیے جاتے ہیں جن پر ایک ناول اپنی بنیاد رکھتا ہے اس میں کہانی کے ساتھ 'پلاٹ' جو کہ نہایت مضبوط ہونا چاہیے۔ اسی پہ ہی تمام کہانی کا دارومدار ہوتا ہے پھر ''حالات وواقعات'' جن کو بنیاد بنا کر کہانی لکھی جاتی ہے۔ کردار جو کہ معاشرے کے حقیقی کرداروں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ جن میں حقیقی زندگی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ ''زمان ومکاں'' جو کہ کہانی کو ایک نیا موڑ دیتے ہیں۔ پھر جو بہت ضروری عنصر جس پہ ناول کو اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے وہ اس کا ''اسلوب'' ہوتا ہے۔ اسلوب بیان جو دل میں اتر جاتا ہے اور دماغ میں ایک دیرپا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اسلوب کے بعد ''نقطہ نظر'' کی باری آتی ہے۔ مصنف نے ناول میں جس بات کو مدنظر رکھ کر اور جس نقطہ نظر سے لکھا ہوتا ہے اسے اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ناول کے عناصر ترکیبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پلاٹ میں قصہ نہایت سلیقہ کے ساتھ ڈھلا ہوا ہونا چاہیے۔ ضرورت سے زیادہ واقعات یا حرکات جو نفس قصہ سے کم تعلق رکھتے ہیں یک لخت چھانٹ دینا چاہیے۔ پلاٹ بنانا ویسا ہی ہے جیسے کوئی بت تراش کچھ خاص فنی قاعدوں کے موافق پتھر کی سل کو تراش کر ایک خوشنما بت بنائے مگر خوبی یہ ہے کہ اس میں بناوٹ کا اثر ظاہر نہ ہو۔''(2)

اگر طویل نگاری، حالات وواقعات کو بیان کرنا، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کو مناسب طور پر پیش کرنا ناول نگاری کہلاتا ہے۔ تو ایسے بے شمار ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اگر ناول کا مقصد صرف لوگوں میں ناول سازی، کرداروں کے حوالے سے مثبت ومنفی رجحان دینا ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان اور معاشرے کے حوالے سے لکھنا ہے تو بھی بے شمار ناول مل جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو ادب میں بہترین ناولوں کی کمی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ افسوسناک حد تک کمی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لیے عروج وزوال کے باوجود بھی ناول اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور جدید ناول کی طرف گامزن ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ جس طرح اردو کی باقی اصناف کو ترقی ملی ہے۔ اسی طرح ناول کو بھی ترقی ملنا از حد ضروری ہے۔ ناولوں میں پس ماندگی کے عناصر بے شمار نظر آتے ہیں کسی میں مذہبی سیاسی، ثقافتی اور معاشی پس ماندگیوں کا ذکر ہے تو کہیں تو ناول خود ہی اپنے اصل سے دور نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن

اردو ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمارے ناول میں کہانی بھی ملتی ہے اور کردار بھی، مناظر بھی ہوتے ہیں اور جذباتی مکالمے بھی لیکن ان سب کے امتزاج سے وہ کیٹالسٹ نہیں بنتا جو وہ قاری میں ترفع پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔''(3)

ناول نگار اپنے قلم سے ثقافتی ورثے کی حفاظت، موجودہ معاشرے کے مزاج اور کلچر کی تصویر کشی کرتا ہے۔اس کا لکھا دستاویز کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ پیوستہ اور موجودہ ثقافت کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور کی سیاسی وسماجی صورت حال کی منظر نگاری کرتا ہے۔معاشرے کی ترقی اور تنزلی کی نشاندہی کرتا ہیاور تنزلی کی طرف جاتے ہوئے معاشرے کی تمام برائیوں مثلاً تعلیم کا فقدان، چوری، ڈاکہ زنی، بے ایمانی، جنسی تشدد، جنسی بے راہ روی، ملاوٹ اور دھوکہ دہی سے نہ صرف پردہ اٹھاتا ہے بلکہ لمحہ فکریہ بھی پیدا کرتا ہیکہ ان سے کیسے چھٹکارا ممکن ہوسکتا ہے۔موجودہ دور میں اردو ناول ایک نئی راہ اختیار کر گیا ہے یہ تبدیل شدہ عصریت کی نشاندہی ہے یعنی اب ہمارے ناول میں ان وجوہات کو سامنے نہیں لایا جاتا جو ترقی وتنزلی کا باعث ہیں۔اب ہم افسوس تو کرتے ہیں کہ ہم عام زندگی میں ملکی سطح پر جنگ وجدل، تعلیم کے فقدان، عوم الناس کی ذہنی پس ماندگی، انفرادی واجتماعی جسمانی جبر وتشدد، زبان وتہذیب کی زوال پذیری، اقدار کی پامالی پر اختیارات کے محدود دائرہ کار کی وجہ سے احساس ہونے کے باوجود اس پس ماندگی اور پامالی سے پردہ نہیں اٹھاتے وہ ہاتھ جو ہماری جڑوں کو کاٹنے کا سبب بنتے ہیں وہ ہمارے قلم کی پہنچ سے دور ہی رہتے ہیں۔

اردو ناول میں نئے رجحانات کا فقدان پایا جاتا ہے علاقائیت اور ثقافت کے مسائل کو اہمیت ہی نہیں دی جاتی جبکہ ان کو ہی ناول کا حصہ مانا جاتا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک کی الگ ترجیحات ہوتی ہیں۔اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے پس ماندگی کے اسباب اور وجوہات پر نشر ثانی کرنا اور جائزہ پیش کرنا ناول نگاری کی اپنے قلم پر گرفت اور حالات حاضرہ یعنی موجودہ دور میں کیا حالات درپیش ہیں۔اس سے باخبری کو واضح کرتا ہے یہی وقت کی ضرورت ہے اسی طرح آگہی اور

بصیرت کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔حالات حاضرہ پر مکمل گرفت سے آنے والے ادیبوں کے لیے ایک نئی راہ کھل جاتی ہے اور حاصل شدہ آگہی سے آئندہ دور کے لیے لائحہ عمل تیار طے کیا جا سکتا ہے اور تاریک راہیں اور گوشے جو پس ماندگی کا سبب ہیں ان کو منور کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اکثر پس ماندگی کی جو وجہ سامنے آتی ہے وہ ادیب کا محدود فن قاری کی فکر کو بھی محدود کر دیتا ہے۔ناولوں میں ہمارے پسندیدہ موضوعات میں زیادہ تر ماضی میں اونچے مرتبے پر فخر اور پھر زوال پذیری کے نوحے،وطن بدر کے دکھ،اپنوں کے ظلم وستم ہیں جو ادب کی نئی راہوں پر چلنے کیلئے تیار ہے۔ایسے بہت سے نئے اور پرانے موضوعات ہیں جو ادیب کے قلم کی سیاہی بن کر صفحہ قرطاس پر بکھرنے کے لیے تیار ہیں۔لیکن اپنی تحریر کو ایک ہی انداز کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے ان کو آفاقی طرز تحریر میں ڈھالنا ہوگا۔اس کے لیے نئی ترجیحات ورجحانات سے استفادہ ضروری ہے۔ادب کو ہر عہد میں اتار چڑھاؤ کا سامنا رہا ہے لیکن ہر عہد میں ہی ادیبوں نے ادب کو نئی راہ سے ہم کنار کیا ہے اور اپنی محنت سے ادب کو مختلف اصناف سے متعارف کروایا ہے۔اردو ادب میں ناول بھی بطور صنف اسی محنت کا ثمر ہے۔

اردو ناول کو ایک الگ مقام حاصل ہے ناول نگار ایک نئی دنیا سے متعارف کرواتا ہے قاری کو پڑھتے ہوئے یہ احساس شدت سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے قلم کے ذریعے ہمارے ہی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔جس میں دکھ،سکھ، جنگ صلح، زمیندار، مزدور، بادشاہ اور غلام بھی زیر بحث ہوتے ہیں اور اس بحث کی بنیاد روزمرہ کی زندگی ہوتی ہے ان کو صرف تخیل کی پرواز کہنا غلط ہوگا۔یہاں یہ بات قابل غور ہے اور اہم بھی کہ جب ہم اردو ناول کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں تو ذہن میں سب سے پہلے مولوی نذیر احمد صاحب کا نقش ابھرتا ہے۔

ان کے ناول مسلم سماج کی بہتری واصلاح کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں۔مگر کچھ نقادوں کے نزدیک مولوی ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا شمار ناول نگاروں میں نہیں ہوتا کیونکہ ان کے مطابق مولوی صاحب کے ناول جدید ناول کے مطالبات کو پورا کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

نقادوں کا ماننا ہے کہ مولوی صاحب کے ناول صرف تبلیغی ناول کہلاتے ہیں جو پند ونصائح کا

رنگ پکڑتے ہیں اور کسی حد تک یہ بات سچ بھی ہے کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ انھوں نے یہ ناول اپنی بیٹیوں کی اصلاح کے لیے لکھے تھے لیکن ناولوں میں عام انسانی زندگی کی حقیقتیں ان کے ناولوں میں نمایاں ہیں۔ناولوں کی داغ بیل انھوں نے ''بنات النعش''، ''توبۃ النصوح'' اور ''مراۃ العروس'' لکھ کر ڈالی ہے جو ناول کا خشت اول کہلاتے ہیں۔رام بابو سکسینہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> ''سرسید مرحوم کے رفقاء کار نے جن کو زبان اردو کا نورتن سمجھنا چاہیے۔زبان اور ادب اردو کے ساتھ احسان عظیم کیے اور بیش بہا خدمات انجام دیں۔مولانا حالی کی قومی نظمیں اور تنقیدی مضامین علامہ شبلی اور مولانا ذکاء اللہ کی تاریخی تصانیف،مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی اور پولیٹیکل مضامین ولیکچرار مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور دیگر تصانیف جن میں ادب آموزی کے ساتھ ایک لطیف ظرافت کا بھی رنگ ہے۔ان سب سے نہ صرف لائق مصنفین کے اہل قوم و مذہب ہی کو فائدہ پہنچا بلکہ وہ تمام ملک کے واسطے یکساں طور پر مفید ثابت ہوئے۔''(4)

ڈپٹی نذیر احمد نے جس طرح آغاز کیا انھوں نے معاشرتی زندگی کی اصطلاح اور ناول نگاری میں ایک نیا رشتہ قائم کیا۔جس طرح وہ لکھتے ہوئے فصاحت و بلاغت سے کام لیتے ہیں، پڑھنے والے کو اپنے اوپر ایک سحر طاری ہوتا محسوس ہوتا ہے اس میں ان کے اصلاحی مزاج اور منطقی فکر کو خاصہ دخل حاصل ہے۔

آج ناول اور فکشن کی دنیا کافی بدل چکی ہے المیہ یہ ہے کہ ہمارے نقاد اپنے اپنے تخیل کے مطابق ایک نئی تشریح ایک نیا مفہوم پیش کر رہے ہیں۔اگر ہم ناول کی تاریخ میں جائیں یعنی غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اس صنف کا وجود ہی نثر میں کچھ نیا کرنے کی غرض سے ہوا۔آج جب دنیا ترقی کی منازل طے کر رہی ہے اور انسان کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا ہے۔وہ کیسے اس مقام تک پہنچا اور اس کو کن مسائل سے گزرنا پڑا؟ ان مسائل کو ناول میں اب ایک نئی جہت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔انسان اب

اس دور میں جی رہا ہے، جہاں حقیقتوں کو اخلاقیات کے پردوں کے پیچھے نہیں دبایا جا سکتا ہے۔

آج کے دور میں انسان کو کامیابی کی سیڑھیاں چڑھنے کیلیے جو مسائل لاحق ہیں اگر ان کو چھپا لیا جائے تو یہ اردو ادب کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ آج کی نئی نسل کو اس حقیقت سے آنکھیں ملانے کی لیے پس پردہ حقیقتوں سے پردہ ہٹانا ہوگا۔ فرسودہ اخلاقی ضابطوں سے گریز کرتے ہوئے ادب کو ایک نئی راہ دکھانی ہوگی اور ادب سے انصاف کرنا ہوگا لیکن بات یہاں اخلاق اور ادب کی آتی ہے۔ ہمیں ادب کو ایک نئی جہت سے متعارف کروانے کیلئے اخلاقیات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا، تاکہ آج کا نوجوان نئی نسل اخلاقیات سے کٹ کر نہ رہ جائے۔

آج اگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے تو ہم اس میں کامیاب ہو جائیں گے، ادب کو ایک نئی جہت سے متعارف بھی کروا سکیں گیا ور اخلاقیات کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس بات کو عیاں کیا جائے کہ بات کس طرح سے درست ہے اور کس طرح سے غلط ہے۔ جہاں ہر بات کا سباق ہوتا ہے وہاں یقیناً اس کے سیاق کو بھی مدنظر رکھا جائے پھر کوئی فیصلہ اخذ کیا جائے کہ کہانی کو کس رخ سے دیکھنا ہے۔ اردو ادب بے شمار ناولوں کا خزانہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جن میں ایسے لازوال ناول ہیں، جو حقیقت کے قریب تر لکھے گئے ہیں۔

جن میں معاشرے میں ہونے والے جرائم، ایسی تاریک گلیوں اور روشن گھروں میں خاموش مکینوں کا ذکر ملتا ہے کہ قاری کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان حقیقتوں کا عام انسان کو بھی اگر علم ہو جائے تو معاشرے میں ہونے والے بگاڑ اور پس ماندگیوں کی وجوہات کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ مکمل طور پر نہ سہی مگر اس کیلیے یک باشعور ذہن کو ایک نئی راہ ایک نئی منزل ضرور مل سکتی ہے۔

اردو ناول میں پس ماندگی کے مظاہر

حالیہ دور میں اردو ناول لکھنے والے چند ادیبوں نے اس بات کو ضروری سمجھا اور اس ضرورت کو محسوس کیا کہ پس ماندہ طبقہ کے مسائل کو منظر عام پر لایا جائے اور اردو ناول میں پس ماندگی کے مظاہر کو اجاگر کیا جائے۔ ایک لمبے عرصے سے ناول کی ایک ہی تعریف چلی آ رہی ہے کہ: It is a vheicle of social critism۔ اور میرے نزدیک یہ تعریف کئی لحاظ سے ادھوری ہے کیونکہ

ہم معاشرے پر لکھتے ہوئے اسکے تمام عوامل کو نہیں لکھ سکتے۔ہم ہر بات پر قلم اٹھا سکتے ہیں لیکن پھر بھی کچھ حالات ایسے ہیں جن کی پہنچ ہمارے نزدیک مشکل ہے اندر کے حالات الگ بھی ہو سکتے ہیں۔ہماری سوچ کے مطابق حالات کو ہم جزوی شکل تو ضرور دے سکتے ہیں لیکن حتمی نہیں۔

ناول کی تعریف کو وسعت دینا ہوگی تا کہ زندگی گزرے اور آئندہ زمانے میں بھی اپنے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات کو پیش کر سکے، ہر ناول کے فکری جائزے کی ایک اصل صورت سامنے آسکے۔یہ بات بھی درست ہے کہ جذبات واحساسات کی ایک حد ہوتی ہے جس سے وہ آگے نہیں نکل پاتے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ ناول نے ہی ایسے طوفانوں کا سامنا کیا ہے۔جو معاشرے کی چھپی ہوئی غلطیوں،کمیوں سے پردہ اٹھانے میں کامیاب رہا ہے۔

ناول کی یہ تعریف ادھوری اس لیے بھی ہے کہ ہمارا ناول نگار اس بات پر ایمان لے آیا ہے۔ افسانے کی کہانی کو دس گناہ زیادہ طول دے دیا جائے تو وہ ناول بن جاتا ہے۔گزشتہ ستر سال سے یہ تعریف اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ اب یہ تعریف گھر کر گئی ہے کہ جا بجا مکالموں سے صفحات کالے کرتے رہنے سے ایک عدد معرکتہ الآرا ناول منظر عام پر آجائے گا۔اردو ادب میں متعدد ناول منظر عام پر آئے ہیں۔جن میں گھریلو،تاریخی،سیاسی،سماجی اور ثقافتی پس ماندگی سے متعلق موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ان میں چند ناولوں کا فکری جائزہ پیش خدمت ہے۔

نولکھی کوٹھی

''نولکھی کوٹھی''علی اکبر ناطق کا ناول ہے۔یہ ناول تاریخ پہ لکھی گئی ایک کہانی ہے کیونکہ تاریخی کہانی ہے اس لیے اس ناول کے سارے کردار روایتی ہیں اور تقسیم ہند پر لکھے جانے والے بے شمار ناولوں میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے تاریخی واقعات کو بدلہ جا سکے۔ناول میں مرکزی حیثیت ولیم کو حاصل ہے جو ایک انگریز ہے۔یہی اس ناول کی خاصیت ہے کہ ولیم جو کہ ایک انگریز ہے اور اپنی اس کوٹھی جس پہ اس ناول کا عنوان ہے''نولکھی کوٹھی'' کا مقیم ہے۔ہندوستانی کہلوانے اور اس سرزمین سے خود کو جوڑ کر رکھنے کی ان تھک کوشش کرتا رہتا ہے۔جس کیلئے وہ وہاں کے رہائشیوں کے لیے بھی بے شمار ایسی خدمات سرانجام دیتا رہتا ہے جن سے ان کی زندگی میں آسانیاں رہیں لیکن اس کی وطن سے محبت کو

اس کی زمین کے لیے خدمت کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ''ولیم'' یہاں سرکاری افسر بھی تھا۔ اس کی شریک حیات جس کو بہت چاہتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ وہ ہمیشہ اس کا ساتھ دے گی۔ وہ بھی اس مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور ولیم اکیلا ہندوستان میں رہ جاتا ہے، بالآخر زندگی کی جنگ ہار جاتا ہے اور اپنی پہچان نہیں بنا پاتا۔ علی اکبر ناطق نولکھی کوٹھی میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''آج میں پھر ان ٹھنڈی ہواؤں کا لطف لیتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس طرف بڑھ رہا تھا جیسے ہی اس کوٹھی پر پہنچا وہاں اور ہی رنگ تھے۔ مغلیوں کے بچے صحن میں اچھل کود کر رہے تھے۔ ذرا غور کیا تو پتا چلا کہ وہاں کوئی اور ہی خاندان آباد ہے۔ میں نے جائزہ لینے کے لیے بھرپور نظر ماری لیکن مجھے ولیم نظر نہ آیا۔ بالآخر انہی میں سے ایک آدمی سے پوچھا: ''یہاں ایک بوڑھا انگریز تھا وہ کہاں ہے؟؟'' اس نے انتہائی لاپرواہی سے جواب دیا، کاکا اسے تو فوت ہوئے بھی ہفتہ ہو گیا ہے۔''(5)

ایک انگریز کا ہندوستان سے اس قدر دلی لگاؤ، اس محبت کو مصنف نے ناول میں دکھا کر انسانی اقدار کو بہت خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے لیکن ساتھ ہی معاشرتی برائی کو بھی دکھایا ہے کہ اس سے اس کا آبائی بنگلہ چھین لیا جاتا ہے اور وہ وہیں رہنا چاہتا ہے، اس لیے جب ہندوستان کی تقسیم ہو جاتی ہے تو وہ وہی کہیں منتقل ہو جاتا ہے اور غربت کی زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔

دوسرا بڑا کردار جو ناول نگار نے اپنی کہانی میں پیش کیا ہے، وہ ''غلام حیدر'' کا ہے۔ جس کے باپ کو قتل کر دیا جاتا ہے اور اس کے بدلے کیلئے وہ دل میں دشمنی کی آگ کو زندہ رکھتا ہے اور بدلہ لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ناطق نے کہانی میں جو سکھوں اور پنجابیوں کے درمیان لڑائی دکھائی ہے اس لڑائی میں تقسیم کے دوران مسلمانوں کو پل پار کرواتے ہوئے غلام حیدر بھی مارا جاتا ہے۔ مصنف نے ناول میں دشمنی، مار دھاڑ، چوری، قتل و غارت، محبت، عشق، ڈیرے داری، رسہ گیری، گولی بارود کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے گویا وہ اس جنگ کو دیکھ رہا ہے۔ ہر ایک واقعہ کو پڑھنے

کے بعد کہانی میں نیا موڑ آجاتا ہے جسے پڑھ کر قاری چونک جاتا ہے۔کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ مصنف کو تاریخ سے گہری واقفیت تھی۔تقسیم ہند پر لکھے گئے اس ناول میں اس نے ہندو مسلم دشمنی کا منظر پیش کیا ہے۔جس میں ''غلام حیدر'' اپنے باپ ''شیر حیدر'' کا سودھا سنگھ سے بدلہ لیتا ہے اور اس کے لیے اسے کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔پل پار کرنے کے منظر میں دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ سے پل چند ہی لمحوں میں اس طرح خالی ہو گیا جیسے کہ خود صاف کیا ہو۔غلام حیدر کو ایک باوفا چھوٹا جاگیر دار بتایا گیا ہے جو کسی بھی طرح کے حالات میں اپنے گاؤں والوں کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔اسی لیے جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر رہا تھا وہی اس کا آخری سفر ثابت ہوا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔نولکھی کوٹھی سے اقتباس ہے:

> ''میجر صاحب کے کیبن کو گولیوں کے دھماکوں سے آگ لگ کر، گھاس پھونس کو اس طرح جلا رہی تھی، جیسے چتا سے الاؤ اٹھ رہے ہوں۔یہ حالت دیکھ کر میجر کیبن سے باہر کی طرف بھاگ اٹھا۔انھی اوقات میں غلام حیدر نے تاک کر اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی، جن میں سے دو گولیاں اس کے سر میں جالگیں اور وہ لڑھک گئے۔گورکھا سپاہیوں نے اپنے افسر کو یوں ڈھیر ہوتے دیکھا تو وہ بوکھلا گئے۔اسی بوکھلاہٹ میں انھوں نے اندھا دھند فائرنگ برسا دی۔اس دوطرفہ شدید فائرنگ میں دونوں طرف کے لڑنے والے اور دوسرے لوگ بیروں کی طرح گرنے لگے۔چند ہی لمحوں میں غلام حیدر بھی گولیوں کی بارش میں اپنے ساتھیوں سمیت وہیں ہیڈ کے پل پر خون میں لت پت ہو گیا اور بارش کی رم جھم میں کچی سڑک پر منہ کے بل گر پڑا لیکن ابھی جانی چھینبا بچا ہوا تھا۔''(6)

بلاشبہ ''نولکھی کوٹھی'' اس دور کا ایک بڑا ناول ہے۔بے حد منفرد بیانیہ کیساتھ ایک ایسی تاریخی کہانی مسائل سے گھری ہوئی کہ کس طرح لوگوں کو دشمنی کی وجہ سے اپنی جان سے جانا پڑا کس طرح

غلام حیدر کو جلاوطن ہونا پڑا۔ یہ صرف کہانی نہیں ہے بلکہ تقسیم ہند کی ساٹھ سال کی تاریخ ہے۔ ناول کے ذریعے اس نے معاشرے میں ہونے والی برائیوں اور کچھ ایسی پس ماندگیوں کا ذکر کیا ہے جن سے ایک عام آدمی ناواقف رہتا ہے۔ بعض اوقات انسان کے ساتھ پیش آنے والے حالات اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ذرا رک کر غور کر پائے کہ ایسا ہونا دراصل معاشرے ہی کی پھیلائی ہوئی برائی ہے ،اسی جڑ نے تمام طرف انتشار پھیلا رکھا ہے۔ سکھوں اور پنجابیوں کی لڑائی میں دشمن فائدہ اٹھا رہا تھا مفاد پرست کبھی چاہتا ہی نہ تھا کہ یہ معاملہ حل ہو جائے اور وہ اس لڑائی کو مزید ہوا دیتے رہے اور بالآخر لڑائی تقسیم پہ آ کر رکی مگر ختم نہ ہوئی۔ تقسیم کے دوران بھی تمام جمع پونجی تمام رشتے درہم برہم ہو گئے، ہزاروں جانیں جانے پر بھی، انتقام کی آگ سینوں میں جلتی رہی جو ٹھنڈی نہ ہوئی۔ بلاشبہ ناطق نے ناول کے ساتھ انصاف کیا ہے، بہت کھلے اور صاف لفظوں میں اس نے معاشرتی پس ماندگیوں کو بے نقاب کیا ہے۔

خس وخشاک زمانے

پاکستان میں 2010ء میں منظر عام پر آنے والا ناول خس وخاشاک زمانے مستنصر حسین تارڑ نے تحریر کیا۔ ایک ایسا ناول جس میں لاہور کی منظر نگاری کی گئی ہے لاہور میں رہنے والوں کا ماحول ،رہن سہن اور گاؤں سے آنے والے وہ افراد جو روزگار کی تلاش میں بڑے شہروں کی طرف اپنا رخ کرتے ہیں اور پھر کس طرح ان کی زندگی گزرتی ہے، ان کو کن مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان تمام باتوں کو بہت خوبصورتی سے خس وخاشاک زمانے میں مصنف نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ ناول میں مصنف نے دنیا پور سے آئے ہوئے لوگوں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ سبزی منڈی آتے ہیں اور لاہور سبزی منڈی میں اپنا سارا مال بیچ کر شام کی ٹرین سے واپس اپنے گاؤں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ مصنف ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جو اپنے آپ کو بلند سمجھتے ہیں یعنی جاٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود کو تمام ذاتوں سے اعلیٰ اور باقی تمام ذاتوں کو خود سے کمتر اور اپنا خادم تصور کرتے ہیں۔ مصنف نے بتایا ہے کہ جب یہی لوگ اپنے گاؤں سے شہر میں آ کر آباد ہو جاتے ہیں تو انھیں شہر کی تنگ گلیوں اور چھوٹے مکانوں کو دیکھتے ہوئے اپنے گاؤں کے کھلے گھر اور گوبر کی بدبوئیں یاد آتی ہیں۔

''خس وخاشاک زمانے'' کو پاکستان کی ایک ایسی کہانی کہا جا سکتا ہے کہ جو معاشرے کی

تہذیبی و اخلاقی اقدار اور پھر معاشرے میں بدلتے ہوئے اخلاقی رویوں کو بیان کرتی ہے۔ناول میں دو خاندانوں کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جس کو موضوع بناتے ہوئے اس نے ان حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جن پر بات کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔کہانی نسلوں پر پھیلی ہوئی ایک داستان کی صورت ہے۔تقسیم ہند و برصغیر کے بارے میں لکھا گیا ہے اور ان تلخ حقائق کو جو تاریخ میں رونما ہو چکے ہیں ان کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔جن کو معاشرے میں سخت ناپسند کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان باتوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ دوبارہ موضوع بنیں۔مصنف نے یہ ناول روایتی موضوعات سے ہٹ کر لکھا ہے۔ان موضوعات میں ناجائز طور پر پیدا ہونے والے بچے،مردہ جانوروں کا گوشت کھانے،لونڈے بازی،تقسیم ہند،ہم جنس پرستی،مغربی زندگی،جسم کا کاروبار کرنے کے علاوہ اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک چلے جانے والے خاندانوں کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان اسلام کے دشمن رویوں کو بھی قلم بند کیا ہے جو نائن الیون کے واقعات کے بعد درپیش ہوئے۔مزید یہ کہ مصنف نے ناول کی کہانی کو گوجرانوالہ کے گاؤں نت کلاں کے گرد گھومتا دکھایا ہے۔مستنصر حسین لکھتے ہیں:

> ''اگر بخت جہاں کی پر تکبر شوکت اور شانداری نہ رہی تھی تو دنیا پور بھی تو وہ نہ رہا تھا۔۔۔اس کے سکھ یار چلے گئے تھے۔۔۔اپنی آبائی زمینوں،کوٹھوں،گھروں اور شمشان گھاٹوں سے بے دخل ہو کر جتنے بھی چھروں اور بلموں سے بچ نکلے تھے چلے گئے تھے۔بیشتر سردارنیوں نے نت کلاں کے برگدوالے کنویں میں کود کر جانیں دے دی تھیں۔۔۔ادھر جالندھر امرتسر اور پٹیالے سے لٹ پٹ کر آنے والے بھی بیشتر مرد تھے۔۔۔ان کی عورتیں سکھ اٹھا کے لے گئے تھے۔۔۔ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا جس میں ان کی ماؤں بہنوں کے ادھڑے ہوئے برہنہ بدن ڈوبتے ابھرتے تھے۔''(7)

مصنف نے ناول میں ذات پات کے بارے میں لکھا ہے کہ اس ذات پاک اونچ نیچ کی

وجہ سے معاشرے میں طبقات بن چکے ہیں۔جس میں اعلیٰ ذات والا کمتر کو کمی کمین تصور کرتا ہے۔دنیا پور جس کا ذکر مصنف کرتے ہیں کہ وہاں جاٹ برادری رہتی تھی اور وہ خود کو سردار تصور کرتے ہیں۔جاٹ کاشت کاری کرتے تھے جاٹوں کے نزدیک دوسری ذات کے لوگ جو ہر کام کر گزرتے ہیں، وہ خادم ہیں اور کمتر ہیں، مصنف نے کشمیریوں کا ذکر کیا ہے جو ٹانگے چلاتے تھے دکانیں تھیں ان کی بزاز کا کام کرتے یہاں تک کے جوتے بھی سلائی کرتے۔جو کام جولاہوں کا ہے یعنی کھڈیوں پر دریاں اور کھیس بننا وہ بھی یہ کشمیری لوگ کرتے تھے۔بس اڈے پر جب بس آ کر رکتی تو یہ لوگ جلدی سے سموسے اور پکوڑے لے کر آگے بڑھ جاتے وہ کسی کام کو بھی کرتے ہوئے عار محسوس نہ کرتیتھے۔یہاں تک کے درزیوں کا کام بھی وہ نہایت عمدگی سے کرتیاور جاٹوں کے نزدیک ایسے تمام کام کرنے والے حتیٰ کے برگد کی چھاؤں میں تربوز اور خربوزوں کے انباروں پر کھڑے ہو کر انہیں فروخت کرنا گلا پھاڑ پھاڑ کر آواز لگانا۔یہ تمام کام صرف بے حیا لوگ ہی کر سکتے تھے۔وہ ایسے لوگوں کو اچھوت خیال کرتے تھے۔مستنصر حسین تارڑ خس وخاشاک میں لکھتے ہیں:

> ''جاٹوں کے پاس زمینوں کی نسبت تفاخر زیادہ تاپ اور انہیں اپنی بے خبری اور پس ماندگی پر ناز تھا۔البتہ ان محلوں کے بارے میں کہا جاسکاں ہے کہ یہاں دو چار سو برس ادھر یا ادھر ہونے سے انھیں کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔یہ ویسے کہ ویسے ہی تھجیسے کہ کبھی تھے۔جی ٹی روڈ کے آس پاس کشمیریوں کی اکثریت تھی۔یہ کشمیری لوگ جاٹوں کے نزدیک نہایت کم ذات اور حقیر مخلوق تھے۔ان کے کم کمین ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا تھا کہ وہ ہر کام کر گزرتے تھے جو جاٹوں کے نزدیک معیوب ٹھہرتا تھا۔''(8)

مصنف کے مطابق اگر کردار نگاری کی بات کی جائے تو ناول میں تقریباً 74 کردار موجودہ ہیں۔جن میں مرکزی حیثیت جہاں بخت کو حاصل ہے۔ناول کا ہر کردار اپنے اندر ایک الگ دنیا رکھتا ہے اور ایک الگ موضوع کا نمائندہ تصور کیا جاسکتا ہے۔مرکزی کردار بخت جہاں جو کے ایک جاٹ ہے۔اس

میں بری خصلتیں عروج پر بتائی گئی ہیں۔ظالم ہے، وہ اپنی خصلتوں سے ادراک کے باوجود بھی اپنی بری خصلتوں کے آگے مجبور بتایا گیا ہے۔وہ عورتوں کا رسیا ہے ایسی عورتیں جو منہ توڑ جوانی سے بھری ہیں اور اپنی اسی بری خصلت کی وجہ سے اپنے جگری دوست کی بیوی سے نکاح کر لیتا ہے کیونکہ بخت کو کہانی کے پہلے حصے میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے۔اس لیے جب اسے ہجرت کرنا پڑی تو اس واقعے کو مصنف نے بڑی خوبصورتی سے بتایا ہے۔

> ''کیسی کیسی مجبور ہجرتیں اس کی قسمت میں آئی تھیں۔۔۔اور ہجرت مجبور ہوتی ہے۔۔۔۔وہ آج ایک اور ہجرت کی مسافت میں اس سرحدی چوکی کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ جو لوگ اس مجبوری میں ہوتے ہیں جنہیں اپنی آبائی بستیاں چھوڑنی پڑتی ہیں تو زندگی کی آخری سانسوں تک وہ بستیاں ان کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ان کی قبروں کی مٹی ساتھ چلی آتی ہیں۔''(9)

''خس و خاشاک زمانے'' مصنف کے چالیس سالا ادبی سفر کا نچوڑ ہے۔ناول کا پہلا حصہ سیاست، روایات، تاریخ اور تہذیب بتایا ہے تو دوسرے حصے میں پاکستانی نژاد اور انگریزی ناول نگاروں نے نائن الیون کے بعد مسلم شناختی بحران پر لکھا گیا ہے۔اس کے علاوہ ابتدا میں تہذیب، تاریخ، برصغیر کی تقسیم اور مختلف جنگوں، زندگی موت کی صورتحال سر اٹھاتے منہ زور انسانی رویے، فرقہ بندی اور نسلی تفاخر جیسے متعدد موضوعات کو سمیٹا گیا ہے۔انہوں نے اپنے ناول کے ذریعے سر اٹھاتے ہوئے منہ زور انسانی رویوں کا ذکر کیا ہے۔ جہاں بخت جو کہ ہر طرح کی بری خصلت رکھتا ہے۔عورتوں کے ساتھ اس کا رویہ غیر مناسب ہے۔اور یہی پس ماندگی یقینی طور پر کسی بھی معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔نسلی تفاخر جو کہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور یقیناً آج بھی اس کی وجہ سے معاشرہ الگ الگ رستوں پر چلتا نظر آتا ہے۔قوم ایک نہیں ہو پاتی کیونکہ برابری کے حقوق سے محروم عوام کو جب اچھوت یا کسی اور کو ان پر برتری دی جاتی ہے تو یہی بات ناگواری کا سبب بنتی ہے۔اور یہ کبھی نہ ختم ہونے والی معاشرتی پس ماندگی ہے۔

لے سانس بھی آہستہ

''لے سانس بھی آہستہ''مشرف ذوقی کا اکیسویں صدی میں لکھا گیا ایک بہت بڑا ناول ہے جو حلال وحرام کی تمیز، جائز و ناجائز کو ایک الگ نظر سے دیکھتے ہوئے ایک الگ مقام پر لے جاتا ہے۔اس ناول کو پڑھتے ہوئے قاری نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔کیونکہ اس میں کچھ ایسی باتوں کو جو معاشرے میں کبھی بھی گفتگو کا درجہ حاصل نہیں کرتیں اور پس پردہ سر اٹھا کر دم توڑ دیتی ہیں، وجود ختم ہو جاتا ہے اور خلش باقی رہ جاتی ہے اور اسی خلش کو انسان اپنے اندر دبائے خود بھی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ان باتوں کو اسے قلم بند کرنا کافی مشکل رہا ہوگا کہ کس طرح ایک مہذب انسان اخلاقیات کی دیوار کو گرا دیتا ہے اور تمام تر حدوں کو پس پشت ڈال کر رستہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔مشرف ذوقی کے ناول میں ایک الگ ہی دنیا آباد ہے۔جہاں تہذیب ختم ہو رہی ہے یا اس کا انداز بدل رہا ہے اور دنیا میں کیا کیا مسائل ابھر رہے ہیں وہاں مصنف نے اس المیہ کو واضح کیا ہے کہ انسان جتنی بھی ترقی کر لے بے شک ترقی کی جدوجہد کو پار کرتا ہوا زندگی کی ہر خواہش کو پورا کر لے پھر بھی وہ اپنے اندر کے جانور کو ختم نہیں کر سکتا۔بات یہاں یہ سامنے آتی ہے کہ کیسی ترقی، کس کی، کہاں کی ترقی، جب انسان اپنے اندر کا جانور ہی ختم نہیں کر پایا۔مصنف نفسیات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے نظر آتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایک فکشن نگار تب تک ایک اچھا فکشن قطعی تخلیق نہیں کر سکتا جب تک وہ انسان کی سائیکی پر گرفت نہ کر لے۔انسان کے سماجی روابط اور نفسیات کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔راس میکلی نے اپنی کتاب ''دی فلاسفی آف فکشن''میں لکھا ہے:

> Psychology is not be forgotton, avoid or dismissed absoloutly quarantined from philosophy on the bases of any piecemeal prvitional scientific status ((10

راس میکلی کے اس نظریے کے مطابق فکشن میں نفسیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔انہوں

نے بھی اسی طریقہ کار کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک انوکھی کہانی لکھی ہے۔ یہ ایک باپ اور بیٹی کی کہانی ہے۔ بیٹی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہے۔ قاری جب یہ کہانی پڑھتا ہے تو معاشرتی پس ماندگی کی اس قسم کو پڑھتے ہوئے اس کے رونگھٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس ناول میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو تقسیم کے بعد یعنی پاکستان میں آنے کے بعد وہ مسلمان جو ابھی تک اسی کشمکش میں ہیں کہ ان کا فیصلہ ٹھیک تھا کہ غلط پاکستان میں رہنا چاہیے تھا کہ ہندوستان میں ایسی صورت حال میں ان سے جو بھی فیصلہ ہوتا وہ ان کو نقصان یعنی خسارے کا ہی لگتا ہے۔ کرداروں کی بے بسی کو بہت ہی واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ناول میں مجبور باپ جو اپنی معذور بیٹی کا ہر طرح سے خیال رکھنے کا وعدہ اپنی بیوی سے کر لیتا ہے اور پھر دنیا میں ہونے والے حالات و واقعات اور ان کے اثرات نئی نسل پر کس طرح سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اس کو ایک مسلسل روتی ہوئی نومولود بچی نگار کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ تہذیب کی نقالی کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ہر عہد میں تبدیلی چاہتا ہے یا یوں کہیے کہ تبدیلی تہذیب کا مقدر ہے اور مصنف نے بھی اپنے اس ناول میں تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ مشرف ذوقی لکھتے ہیں:

> ''تہذیبیں عام طور پر رنگ بدلتی رہتی ہیں پہلے کیا اتنی ترقی تھی؟ اتنے میڈیا ز تھے؟ بچوں کی تربیت اور کردار سازی کے لیے کیا ہمارے پاس وقت ہے؟ اور تربیت ہم نہیں کرتے نہ کردار سازی کرتے ہیں۔ ہم صرف اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر رہے ہیں۔''(11)

مصنف نے ناول میں جن کرداروں کا ذکر کیا ہے ان میں زیادہ تر باپ اور بیٹی کو اہمیت حاصل ہے بیٹی جو کہ نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہے اور اسے پاگل کہا جاتا ہے اور باپ جس کے اوپر تمام تر ذمہ داریاں ہوتی ہے، بیٹی جب جوان ہوتی ہے تو کیونکہ اس نے رشتوں میں ہمیشہ اپنے نزدیک اپنے باپ کو ہی پایا تھا اور اپنے عارضے کی وجہ سے اسے رشتوں کی پہچان نہیں تو وہ اپنے باپ کو صرف ایک مرد کی حیثیت سے ہی پہچانتی ہے۔ باپ کیلئے اس کی بیٹی ایک آزمائش کی طرح ہے جس کو سنبھالنے کی ذمہ

داری کے ساتھ ساتھ اس کیتمام کاموں کو بھی خود ہی دیکھنا پڑتا ہے۔ایسے میں ایک باپ کی کیفیت کیا ہوگی اس کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ایک دن باپ جب بیٹی کی ضد کے آگے جھک جاتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں تو ایک عام انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔

"میں خود سے جنگ لڑ رہا تھا۔۔۔رشتوں کی مقدس دنیا میں سیکس کے جراثیم گھل گئے تھے۔۔۔۔سوالوں کی یہ دنیا مجھے لہولہان کر رہی تھی۔۔۔"(12)

مصنف نے ناول میں باپ کے کردار کو جس طرح پیش کیا ہے وہ تو خاص حالات میں وہ اس گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کے بعد سزا کے طور پر اسے تاحیات گھٹ گھٹ کر جینا ملتا ہے۔بات یہاں صرف تہذیب پہ آ کر رکتی ہے۔جہاں تہذیب دم توڑتی ہے وہاں دوسری تہذیب جگہ لینے کو تیار ہو تی ہے۔بس فرق صرف اتنا ہے کہ ان تہذیبوں میں ہم اپنی اپنی سہولت کے حساب سے مذہب کو چن لیتے ہیں۔اس لیے انسانی رشتے بھی اسی سہولت کی دین ہیں۔جب ہم اندر کے راستے اپنا لیتے ہیں حق بات کہنے،حق بات کا ساتھ دینے سے ڈر جاتے ہیں تو تہذیبیں یا تو مر جاتی ہیں یا پھر بدل جاتی ہیں۔ان تہذیبوں کے بننے اور ٹوٹنے میں مصنف نے جو انسان کی اخلاقیات پر طنز کی ہے وہ قابل غور ہے۔انسان کس طرح سے ایک جانور بن جاتا ہے۔اپنی تمام اخلاقیات کو پس پشت ڈال کر وہ اپنی ایک نئی راہ بنا لیتا ہے۔یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مذہب کیلیے اپنی مرضی کرنا۔یقیناً یہ ذوقی کا ایک اہم ناول ہیجو تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ذوقی کے مطابق:

''دراصل تہذیب جیسی کوئی چیز کبھی تھی ہی نہیں۔ہاں مذہب کے خوف نے الگ الگ تہذیبی سرنگوں کی بنیادیں ڈال دی تھیں۔ادھر خوف کے بادل ہٹے اور ادھر تہذیبوں کے پل ٹوٹنے شروع۔''(13)

اس کا کہنا ہے کہ تہذیبیں ہی ہیں جو خود ہی ٹوٹتی بنتی رہتی ہیں۔انسان خود ہی فرار کی راہ میں سہولت سمجھتا ہے۔یہ ناول ان ہی تہذیبوں کی عکاسی میں لکھا گیا ہے کہ ان کی ایسی کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر تہذیبیں دم توڑتی ہیں۔

آگ

''آگ''عزیز احمد کا مشہور ناول ہے۔اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ آج تک کشمیر کے بارے میں جن دو ناولوں میں لکھا گیا ہے ان میں ایک تو کرشن چندر کا ''شکست'' ہے اور دوسرا ''آگ'' ہے۔ان ناولوں میں کشمیر کے رہنے والوں کی سماجی پس ماندگی ،غربت ،افلاس اور استحصال کو مستقل بحث بنایا گیا ہے۔دونوں کا انداز ہ الگ ضرور ہے مگر مقصد ایک ہی ہے۔یعنی بنیادی موضوع کشمیر کی سماجی وسیاسی صورت حال ہے وہاں رہنے والے لوگوں کی اونچ نیچ ہندوانہ سماج میں ذات پات کو لے کر سفاکانہ طریقہ کار پھر اس کا مرکزی کردار بھی عمل قوت سے محروم ہے۔

اگر تاریخی مناظر میں دیکھا جائے تو کشمیر کی صورت حال کو شعوری طور پر سمجھنے کی کوشش جس میں کی گئی ہے۔وہ عزیز احمد کا ناول ''آگ''ہی ہے۔''آگ'' کا موضوع خاص طور پر کشمیر میں لگی وہ آگ ہے جس نے سارے کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔عزیز احمد نے نہایت سلیقے سے ایک طرف تو انگریز سامراج کے خلاف کشمیر میں اور پورے ملک میں ہونے والی آزادی کی تحریکوں کو آگ کہا ہے اور دوسری طرف ان کاریگروں کے استحصال کو آگ قرار دیا ہے جو قالین بافی کا کام کرتے ہیں۔ناول کی سب سے بڑی خاصیت ہی یہی ہے کہ اس کا حقیقی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''ایک طرف پرا پنجال اور دوسری جانب قراقرم ،بیچ میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح کوہ ہمالیہ سب سے اونچا سلسلہ۔ان پہاڑوں نے کشمیر کی ہری وادی لداخ اور بلتستان کے لق ودق کہساروں کو بال بال بچا لیا اور دس بارہ سال تک شمال اور جنوب کی آگ وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔''(14)

مصنف نے جو محسوس کیا اسے قلم بند کیا ہے ان کے احساسات اور مشاہدات میں بہت وسعت گہرائی ہے۔کشمیر میں رہنے والے لوگوں کا انتہائی گہرائی سے مشاہدہ کیا میرے نزدیک مصنف کا کہنا کہ انھوں نے یہ ناول بہت جلدی میں لکھا ہے۔لیکن میرے مطابق مصنف نے جس قدر گہرائی سے اور کشمیر کے لوگوں کی زندگی کو جس طرح سے آگ میں دکھایا ہے ایسا کبھی بھی اردو ناول میں نظر نہیں آتا۔ایسا کہا جاتا ہے کہ جس طرح ناول میں غربت ،کشمیری مسلمانوں کی کسمپرسی اور ان کے ساتھ کی

جانے والی زیادتی کا خلاصہ کیا ہے۔ایسی پس ماندگی کا مظاہرہ کہیں دیکھنے، سننے کو نہیں ملا ناول نگار لکھتے وقت کچھ ایسی منظر نگاری کرتے ہیں ہیں کہ کشمیریوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کو پڑھ کر قاری خود کو کرب میں محسوس کرتا ہے۔وہ اس درد کو محسوس کرنے لگتا ہے جو ان لوگوں کی زندگی میں مسلسل ٹھر چکا ہے۔مصنف اس بات سے انکاری نہیں ہے کہ یہ قوم بہت محنتی ہے لیکن ان کی محنت کو نظر انداز کر دیا گیا قدر نہیں کی گئی۔اس قدر محنتی ہونے کے باوجود بھی یہ قوم زندگی کی آسائشوں سے محروم زندگی گزار رہی ہے۔آگ ایک دلکش ناول ہے کرداروں کے ذہن میں شعور کی رو جا بجا نظر آتی ہے۔ناول پڑھتے ہوئے ہم بہت آسانی سے کشمیر کے لوگوں کے رہن سہن کو جان جاتے ہیں۔منفا نے فلسفی انداز تحریر اپنایا ہے۔باتوں کو فلسفی انداز تحریر میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری پہ سارا راز بھی عیاں ہو جاتا ہے اور خلش بھی رہ جاتی ہے جسے وہ پڑھنے کے بعد محسوس کرتا ہے اس درد کو، اس غربت کو، ان باتوں کو جو کشمیریوں کے دل میں ان کہی رہ گئی ان چیخوں کو جو بہت چیخ کر بھی اپنی کوئی حیثیت نہ بنا پائی۔

> "ڈرائیور موڑ کا گیر بدلتا ہے، جھاڑیاں بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہیں۔اس پہلے موڑ کے بعد ہم خود ذرا بلند ہیں اور موڑ کے قریب اس طرف سے آتی ہوئی ایک لاری مری کشمیر لائن کی، اس کی پیشانی پر خدا حافظ لکھا ہوا۔۔۔مگر خدا حا فظ زندگی کیلئے یا موت کیلئے؟۔۔۔گزر جاتی ہے اور دونوں طرف ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے مسافروں کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے پھر ہر موڑ سے پر سن گاڑی کی لچک اور بلندی اور زیادہ بلندی، اور اس طرح منظر میں بلند اور پست اور ''نقطہ نظر'' کی تبدیلی''(15)

مصنف نے ناول میں کشمیریوں کے رہن سہن کو بھی بہت مہارت سے بیان کیا ہے۔انھوں نے بتایا ہے کہ وہ کس طرح کے کپڑے پہنتے ہیں اور ان کی صفائی کیلئے وہ ذرا بھی مشقت نہیں کرتے ہیں۔کپڑوں کا اصل رنگ تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔قاری ناول پڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے کہ مصنف نے غربت کو کیا نیا رنگ دیا ہے وہ اس حسین وادی کشمیر میں رہنے والے حسین لوگوں کی کچھ ایسی

عادات کو قلم بند کرتے ہیں کہ جن کو پڑھ کر گھن آتی ہے جو بھی مصنف نے دیکھا اس کو لکھ دینے میں عار محسوس نہیں کی۔ ناول کے پہلے باب ''زوجیلا'' کو جب پڑھتے ہیں تو ساری حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اصل میں جو اس خوبصورت وادی میں بدصورتی ہے وہ سب ''زوجی لا'' کی وجہ سے ہے۔ مصنف ''زوجی لا'' کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس طرف سے سامراج آئے، جراثیم آئے، قالین آئے، نمدائے آئے، مذاہب آئے، انسان آئے، مہاجنی آئے، تعصّبات آئے تو تحریر میں کس قدر گہرائی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ درہ زوجی لا بس ایک درہ نہیں ہے بلکہ اسے خوبصورت وادی میں ایک بدصورت ''کلنک کا ٹیکہ'' گردانا جاتا ہے۔ کہ کس طرح اس پرسکون زندگی میں بے سکونی کو پیدا کیا۔

''اس انسان اس حیوان کے ساتھ جو کچھ آیا کرتا ہے، سب آیا۔ یہ ساڑھے
ہزار فٹ اونچا درہ زوجی لا، یہ ہمالیہ کی پاک پیشانی پر کلنک کا ٹیکا۔'' (16)

مصنف نے ناول ''آگ'' میں اپنے احساسات کو قلم بند کیا ہے۔ وہ مزدور طبقہ کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کس طرح مزدور خود کو اپنے کام میں اتنا مصروف رکھتا ہے۔ سارا سارا دن پتھر توڑتا رہتا ہے پتھر توڑنا گویا اس نے اپنی قسمت ہی سمجھ لیا ہو۔ زمانے سے ملے غم اپنی غربت اپنے حالات کا غصہ وہ پتھروں کو کاری ضرب مار کر نکالتا ہے۔ دھوپ میں مسلسل پتھر توڑنا اور پرواہ کیے بغیر کہ شاید بلندی سے کوئی پتھر آ جائے اور خود ان پتھروں کی طرح جن کو مزدور توڑ رہا ہوتا ہے اسی پتھر کے نیچے آ کے خود بھی اپنی شناخت کو کھو دے اور پھر ان ہی پتھروں میں اس کا وجود بھی کہیں گم ہو جائے۔ مصنف سوچتا ہے کہ پیٹ بھرنے کے اس سے آسان راستے بھی ہیں مگر کیونکہ اس کا نظریہ فلسفیانہ ہے تو وہ ایک گہری سوچ میں قاری کو مبتلا رکھتا ہے کہ غربت کے ہاتھوں مجبور مزدور کو پتھر توڑ کے اپنی محرومی سے باہر آنے کا کوئی حل ملتا ہو وقتی سکون یا پھر اس ڈپریشن کا خاتمہ جو شاید کبھی اس کو اپنی جان لینے پر آمادہ کر لیتا۔ ایسی وادیوں میں رہنے والے پہاڑوں سے گرنے والی مٹی اور پتھروں سے نہیں ڈرتے اور سوچوں کے دریا میں بہتے ہوئے اپنے کام کو مدنظر رکھتے ہوئے سڑک کنارے پتھروں کو کاری ضربیں لگا کر توڑ دینے والے کب خود تیز رفتار آتی لاری کا شکار ہو جائیں اس سے بالکل انجان رہتے ہیں۔ جہلم کے گدلے پانی، تیز آواز اور اس کی لہروں سے مزدور اتنا مانوس ہو چکا ہے کہ پہاڑوں سے

گرتی ہوئی چٹانیں اور پتھر اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔نصیب میں اس طرح موت کا آنا لکھا ہوگا تو کچھ بھی کرلو موت آ کر رہے گی۔ایسے ہی کوئی پتھر پہاڑ سے گرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ جہلم میں بہالے جائے گا اور اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔اس بات سے وہ نہیں ڈرتا۔عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''اس پتھر کو ٹنے والے نے کئی نسلوں سے تیشہ مار کے خودکشی کر لی ہے۔اب گزرتی ہوئی بسیں لاریاں اور موٹریں اس کے نزدیک محض اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ یہ غیر متعلق بھاری بھر کم جانور ہیں جو اگر وہ بے احتیاطی کریں تو اسے کچل کر لولا لنگڑا بنا سکتے ہیں اور اس کی جان لے سکتے ہیں۔''(17)

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ناول نگار نے آگ میں ایک بہت خوبصورت انداز میں کشمیر کو بیان کیا ہے۔ناول میں پس ماندگی کو مختلف انداز میں دکھایا گیا ہے۔کبھی غربت، کسمپرسی، کبھی حکمرانوں کی کی گئی زیادتی، مصنف یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ قوم بہت ذہین ہے مگر ان کے فن ان کی محنت کی کوئی قدر نہیں کرتا یہ پس ماندگی کے مظاہر ہی ہیں جو اس ناول کی کامیابی اور شہرت کا باعث بنے ہیں۔لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ مصنف نے ناول میں جس طرح سیاسی وسماجی، معاشی وتہذیبی مسائل اور حالات کی پیش کش کی ہے اس نے اس ناول کو عصری تاریخ بنا دیا ہے۔انہوں نے آگ کے ذریعے غربت اور کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے والوں کو بے بس زندگی گزارتے دکھایا ہے۔وہ لوگ جو حکمرانوں کی جگہ ان کی ناجائز زیادتیوں کا شکار ہو رہے ہیں اور ایک ایسی زندگی گزار رہے ہیں جو انھوں نے کبھی سوچی بھی نہ تھی اور بالکل بے یارومددگار ہیں۔ایک ایسے مزدور کی زندگی دکھائی ہے جو اپنی محرومیوں کی تکلیف کو بھی اپنے کام کے ذریعے کم کرتا ہے جس وقت وہ زیادہ ڈپریشن میں ہوتا ہے، ذہنی الجھن کا شکار ہوتا ہے اور اپنے دباؤ کو کم کرنا چاہتا ہے۔اس وقت اس کی پتھر پر پڑنے والی کاری ضرب بتاتی ہے کہ وہ کس دباؤ کو محسوس کر رہا ہے اور وہ مزدور اپنے کام میں اتنا محو ہے کہ اسے اچانک آجانے والی موت میں بھی راحت ہی محسوس ہوتی ہے۔

اس نے زندگی میں ایک مائل زدہ انسان کو ایک کے بعد ایک آجانے والی مصیبت زدہ

زندگی گزارتے ہوئے دکھایا ہے۔یقیناً عزیز احمد اپنی اس تخلیقی کاوش میں کامیاب رہے ہیں۔

فائر ایریا

ایسا ہی ایک ناول جس میں پس ماندگی کے مظاہر نظر آتے ہیں۔اس میں ''فائر ایریا'' از الیاس احمد گدی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ناول میں مصنف نے مزدوروں کے ساتھ ہونے والے سلوک کو پیش کیا ہے۔بھوک کو موضوع بنایا ہے یہ بھوک ہی ہے جو اس قدر تڑپ پیدا کرتی ہے کہ ایک انسان مفید اور مضر کے معنی بھول جاتا ہے۔وہ بس یہی خیال کرتا ہے کہ کس طرح سے انھیں اپنے پیٹ کی آگ کو بجھانا ہے۔بغور مطالعہ کیا جائے تو ہندوستان میں صدیوں سے ذات پات کا نظام چلتا آرہا ہے۔آج کے دور میں بھی ذات پات کا نظام اور اس کے اثرات دیہات اور خاص طور پر نچلے اور مڈل کلاس طبقے میں نظر آتے ہیں اور اسی نظام نے زندگی کو خاشیے پہ لا کھڑا کیا ہے۔مزدوروں کے ساتھ خصوصاً ناروا سلوک رکھا جاتا ہے۔اگر کہیں کوئی آواز بلند کی بھی گئی تو ان آوازوں کو دبا دیا گیا۔یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ آوازیں انھی طبقوں نے بلند کی تھیں جنھوں نے خود مزدوروں کا استحصال کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور آج جب ان آوازوں کو دبا دیا گیا تو قلم کی طاقت سے ہی یہ حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اردو ادب میں بھی متوسط اور نچلے طبقوں پر مزدوروں کے ساتھ ہونے والے اس برے سلوک اور خاص طور پر کس مپرسی کی زندگی پر آواز بلند کی گئی ہے۔مختلف افسانے لکھے گئے اور ڈراموں میں بھی اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اداکار نظر آئے مگر بات اداکاری پہ ہی ختم ہوگئی۔لوگوں کے دلوں میں خلش ہی رہ گئی۔اس سلسلے کی ایک کڑی ہمیں ''فائر ایریا'' کی صورت میں نظر آئی۔ناول پڑھتے ہوئے قاری اس زندگی کو محسوس کرتا ہے جہاں ایک عام انسان اپنا دم گھٹتا محسوس کرتا ہے اور ناول میں مزدور اپنے کام میں مگن اس طرح بتائے گئے ہیں کہ کوئلے کی کان کی حدت سے کہیں زیادہ پیٹ کی آگ اِن کو جلاتی ہے اور جس کا بجھ جانا ان کے نزدیک زیادہ معنی رکھتا ہے۔احمد گدی لکھتے ہیں:

> ''زمین جسے بارش کا پانی سیراب کرتا ہے اس کو آدمیوں نے اپنے
> پسینے سے ،اپنے خون سے سینچنا شروع کر دیا۔پھاوڑے،گینتے اور
> شاول ان میں بھوکے اور بدحال لوگوں کے کمزور بازوں کی محنت

شامل ہوئی اور انھوں نے زمین کا سینا شق کر دیا۔ چیر ڈالا پتھروں کی سلوں کو، اوپر کا Over Burden اور کوئلے کی سیاہ چمکیلی سیم دکھلائی گئی۔''(18)

مصنف نے ناول میں بھوک کو موضوع بنایا ہے ہمارے معاشرے میں تمام مسائل کی جڑ یہ بھوک ہی ہے جہاں بھوک کی نوعیت الگ ہے مگر تمام مسائل اسی سے جڑ پکڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھوک ہی ہے جو مزدوروں کو کان کے گھٹن زدہ ماحول میں زمین کے اندر جانے پہ مجبور کرتی ہے۔ان کے نزدیک سب چیزیں ایک جیسی ہیں نفع نقصان سے دور ملنے والے معاوضے کو مدنظر رکھتے ہوئے خود کو زندہ لاش کی طرح زمین کے سپرد کر دیتے ہیں۔ زمین کے اندر رہتے ہوئے انھیں کئی طرح کے خطرے لاحق ہوتے ہیں۔کان کے اندر کی گرم دنیا اس میں پیش آنے والے حادثات بھی ان پہ مسلط ہوتے ہیں۔ اگر یہ زمین ان کے اوپر گر گئی تو ان کی آوازیں اندر کی اندر ہی دب جائیں گی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ کوئی مزدور کان کے اندر اترا تھا اور سب سے بڑا خطرہ جوان کے ذہنوں میں منڈلا رہا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پردہ پوشی یعنی باتوں کو چھپا دیا جاتا ہے۔ حادثوں کا نام ونشان بھی مٹا دیا جاتا ہے لاش کو تو کان میں ہی کہیں دفن کر دیا جاتا ہے اور کان کے اوپر کے لوگ جن کے وہ ماتحت ہوتے ہیں ان کی جیبوں کو گرم کر دیا جاتا ہے اور بات کو ہمیشہ کے لیے چھپا دیا جاتا ہے ان سب خطرات کے باوجود بھی مزدور کان میں کام کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ صرف اور صرف اپنی بھوک کی وجہ سے یہ بھوک ہی ہے جو اسے کان میں جانے پہ مجبور کرتی ہے۔

''یہ الگ دنیا ہوتی ہے اندھیرے میں موت گشت کرتی ہے۔کبھی کہیں چال گر پڑتی ہے، کبھی کول ٹب کا رسی ٹوٹ جاتا ہے، کبھی زہریلی گیس موت کی نقیب بن جاتی ہے، موت کے بعد بھی کوشش کی جاتی ہے کہ لاش کو ہزاروں ٹن ریت میں یا کسی بند گپھا میں دفن کر دیا جائے تاکہ معاوضے سے بچا جا سکے۔''(19)

مزدور اپنے پسینے سے زمین کو سیراب کرتے ہیں اور جب اس طرح اپنے کسی ساتھی کو مرتا

دیکھتے ہیں تو کچھ دن تک خوب ان کے خون کو جوش بھی آتا ہے۔ایسا تب ہوتا ہے جب مقامی پولیس ان کی مدد کے لیے بظاہر تیار ہوتی ہے لیکن ان کو اصل مقصد ہوتا ہے کہ مالکوں کو ڈرا دھمکا کر اپنی جیب گرم کرنا اور اس بات کو ہوا دینے کیلئے یونین کے تمام چھوٹے بڑے لیڈر مزدوروں کو بھڑکانے لگتے ہیں۔ایسے معصوم لوگ ہوتے ہیں یہ مزدور کہ اس فکر کو ان کی چاہت سمجھ لیتے ہیں اور یقین کی حد اس قدر کیفر شتے بھی ان کی معصومیت کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں اور آخر میں ان چھوٹے بڑے لیڈروں کے منہ کو پیسے سے بند کر دیا جاتا ہے۔بالکل اسی مقصد کے لیے ہی تو مزدوروں کو بھڑکا رہے تھے۔

آگ میں تیل ڈالنے کا کام کر رہے تھے اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا تو معاملہ ایسے ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔مزدور بیچارے اپنا سا منہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور واپس یاد آتی ہے ان کو اپنی بھوک، پھر اپنے جذبات کو پس پشت ڈال کر پھر سے اپنی مجبوری کی خاطر اندھیرے میں اترنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں ایک اور زندہ لاش کو کان کے سپرد کرنے یہ بیچارے مزدور ہی ہیں جو اپنی بھوک کی خاطر تمام مجبوریوں کو نظر انداز کیے دیتے ہیں۔ازل سے انسان کی سب سے بڑی مجبوری صرف بھوک ہے بس اسی بات کو ذہن میں رکھے وہ کام کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔جو انہیں پیٹ کا ایندھن بھی دیتا ہے اور رنگین سنہرے خواب بھی۔

> ''اور ایسے معصوم بے ریا اور سیدھے سادھے لوگ بھی جن کی معصومیت پر فرشتے رشک کریں یہ سب اس ویران چٹیل میدان کی تپتی ہوئی دھوپ میں چٹانوں سے نبرد آزمائی کرنے والے لوگ کون سی چیز انھیں یہاں کھینچ لائی ہے؟ان تمام لوگوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے بھوک۔بھوک جو ہزارہا سال سے یا شاید ازل سے انسان کی سب سے بڑی مجبوری رہی ہے۔''(20)

ناول میں الیاس احمد گدی نے جو سب سے اہم موضوع پیش کیا ہے وہ ہے لاقانونیت اسی لاقانونیت کے زور پر یہاں ہر طرح کا راج ہوتا ہے۔کسی حادثے کے ہونے پہ پولیس کا کام یہ ہے کہ یہ آدمی کس سے جڑا ہوا ہے۔اگر وہ کوئی بڑا آدمی ہے تو بات وہاں ہی ختم کر دی جاتی ہے اور اگر کوئی آدمی

چھوٹا ہے تو مکمل چھان بین کی جاتی ہے اور موٹی رقم ہاتھ نہ آنے پر کیس بنا کر کورٹ پہنچا دیا جاتا ہے۔

ہزاروں فٹ نیچے اندھیر نگری میں شدید حبس ہوتا ہے جسم کے ایک ایک مسام سے پسینہ نکلتا ہے اور جب کوئلے کی سیاہ دھول اس پسینے پہ جم جاتی ہے تو آدمی خود بھی سیاہ ہو جاتا ہے۔ نہیں معلوم کہ یہ کوئلوں کی وجہ سے سیاہ ہو چکا ہے، خود پر ہونے والی لاقانونیت کی وجہ سے، انصاف نہ ملنے کی وجہ سے یا پھر اپنی مجبوریوں کی وجہ سے۔ مزدور اس ناول میں سب سے زیادہ مجبور تب معلوم ہوتا ہے جب وہ بھی خود کو انسان سمجھنا چھوڑ دیتا ہے اور خود کو مجبوریوں کی آگ میں جھونک دیتا ہے۔ لاقانونیت کو خود پہ مسلط کر لیتا ہے اپنی آواز کو اپنے اندر کبھی چیخنے کا حق نہیں دیتا۔

اپنی اس ذہنی حالت کے پیش نظر اس غیر انسانی مشقت کو برداشت کرنے کیلئے مزدور شراب پیتے ہیں ناقص شراب جوان کو اندر ہی اندر ختم کر دیتی ہے، لاغر کر دیتی ہے، بیمار کر دیتی ہے یہ کھانستے ہیں اور خون اگلنے لگتے ہیں اور پھر اس طرح وہ قرض کے بوجھ تلے دبتے دبتے سورخوروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور سودخوران کو ماہانہ آمدنی آنے سے پہلے ہی موت کے فرشتوں کی طرح اپنے گھر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ماہانہ ملنے والی آمدن سے بھی دگنا ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ مزدوروں نے اپنی الگ دنیا بنا رکھی ہے جہاں اگر کبھی وہ کان سے بچ جاتے ہیں تو سودخور پکڑ لیتے ہیں۔ سودخوروں سے بچ جائیں تو بیماریاں آلیتی ہیں۔ بس یہ ہر طرف موت ہی ناچتی نظر آتی ہے:

> ''عجب دنیا ہے یہ ملک دولت سے اندھا ہو رہا ہے، لیڈر اپنا حصہ لے کر عیش کر رہے ہیں ٹھیکے دار من مانی قیمت وصول کر کے لاکھوں میں کھیل رہے ہیں، مائنگ کا عملہ رشوت کے رویوں سے آسودہ حال ہے صرف مزدور۔۔۔ بس مزدور ہے۔ جس کو نہ اپنے پسینے کی قیمت ملتی ہے اور نہ اپنے تھوکے ہوئے خون کا معاوضہ۔''(21)

مصنف نے ناول میں عورتوں کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ کس طرح انھیں جنسی استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مرد انھیں ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ لیڈر، ٹھیکیدار، بابو اور مالک تو اپنا حق سمجھ کر اس کی عصمت دری کرتے ہیں۔ اس کی عصمت کو تار تار کر دیا جاتا ہے اور بیچاری عورت کو کسی طرف

سے بھی کوئی سہارا نہیں مل رہا ہوتا اگر وہ راضی ہو جائے تو خاموشی سے اور اگر وہ راضی ہو تو معاملہ بندوق کی نوک پر بھی مرد حل کر لیتا ہے۔لوگ خاموش تماشائی بنے نظر آتے ہیں اور اگر کسی نے آگے بڑھ کے عورت کیلیے حق یا انصاف کی کوشش بھی کی تو اس کے سینے میں گولی اتار دی جاتی ہے۔عورت ہر طرح کے حالات کا اکیلے مقابلہ کر رہی ہوتی ہے۔

مردوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ وہ بچ نہیں سکتی ہے تو وہ بھی کھیل کھیلتی نظر آتی ہے۔اس کے پاس صرف ایک ہتھیار ہے جس سے وہ کہانی کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتی ہے اور وہ ہتھیار اس کے جسم کا ہے۔خود مزدور مردوں کو دبانے،ڈرانے کے لیے بھی اوپر والا طبقہ اس کے گھر کی عزت کو تار تار کرتا ہے۔اس کو زردکوب کیا جاتا ہے۔اور اس کی بہو،بیٹی،اور بیوی کی عزت خراب کر دی جاتی ہے۔اور اس طرح ایک طاقت رکھنے والے مزدور کی قوت کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

اگر کسی میں طاقت ہو بھی تو وہ ایسے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی طاقت کو ظاہر نہیں کرتا اور خاموشی کا تالا لگا لیتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ مخالفت کے نتیجے میں اسے پیس کر رکھ دیا جائے گا۔کولیری میں کام کرنے والی عورتیں جو مردوں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں۔کسی بھی وقت ان کو ہوس پرستی کا نشانہ بنا لیا جاتا ہے۔کولیری کام کا اصول ہے،جو بتایا گیا ہے کہ منہ بند رکھا جائے،آنکھوں اور کانوں کو ناکارہ بنا دیا ،کچھ دیکھو تو بولو نہیں،کچھ سنو تو بتاؤ نہیں۔یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ یہاں لوگوں کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود تو ہیں مگر بولنے والی زبان منہ میں موجود نہیں ہے۔

> ''ننکو اس کو ابھی تک دیکھے جا رہا تھا۔جیسے اس کے چہرے سے کچھ پڑھنا چاہتا ہو۔سہدیو کو ہنسی آ گئی۔ننکو بھائی ایسا مت سمجھیے گا کہ میں اس پر ریجھ گیا ہوں۔عورتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ننکو بولا عورت کو یہاں کون پوچھتا ہے،ٹکے ٹکے کو ملتی ہیں جتنی چاہو۔مگر فائدہ یہ ہے آدمی ڈھول ضرور بجائے مگر اس کو گلے میں نہ ٹانگے۔''(22)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول''فائر ایریا''ادب میں اس کی اہمیت لازوال ہے۔ناول اپنے موضوع کے ساتھ ساتھ ادب میں ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتا ہے۔جس میں معاشرتی

پس ماندگی کے ایسے مظاہر کو بیان کیا گیا ہے جو حقیقت کے قریب ہیں۔ناول میں ایک ذہنی کشمکش دکھائی گئی ہے۔جس میں مزدوروں کا استحصال کیا گیا ہے۔بھوک کو موضوع بنایا گیا ہے،طبقوں کی کشمکش پر قلم اٹھایا گیا ہے۔عورتوں کی معاشرے میں کس طرح درجہ بندی کی گئی ہے، مجبوریوں کو عزت پر ترجیح دی گئی ہے۔طاقت کو عروج پر رکھا گیا ہے۔سودخوروں کے رویے اور مزدوروں کی زندگی کو کھل کر بیان کیا گیا ہے اور بیان کرنے کے لیے جس اسلوب کو مدنظر رکھا گیا ہے وہ پوری طرح سے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔اس ناول میں فن وفکر کا بہت خوبصورت امتزاج ملتا ہے یعنی کسی کو بھی ایک دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔اردو ادب میں اس ناول کی اہمیت لازوال ہے۔الیاس گدی نے مزدوروں کی زندگی کو بہت نزدیک سے محسوس کیا ہے اور اسے اپنے قلم کی آواز دی۔ایک مشینی زندگی گزارنے والا انسان جس کا خود کے کمائے ہوئے پیسوں پر بھی بس نام کا حق ہے۔لاقانونیت میں انسان زندگی گزارتا نہیں بس گزار رہا ہوتا ہے۔دم گھٹنا بے جا حبس زدہ ماحول انسان کو جیتے جی ختم کر دیتا ہے۔ایک نہایت ہی دل کو چھو لینے والا منظر جب مزدور خود کو مجبوری کے تحت انسان ہی سمجھنا چھوڑ دیتا ہے،خود کو مجبوریوں کے سپرد کر دیتا ہے اور خود پہ لاقانونیت کو مسلط کر لیتا ہے۔ایسا تب ہی ہوتا ہے جب انسان بہت زیادہ چیخ و پکار کر چکا ہو اور اس کی آواز ہزاروں سننے والے کان ہونے کے باوجود بھی صرف اپنے ہی کان سن پائیں تو وہ خود کو انسان سمجھنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔یقیناً الیاس گدی نے بہت مجبور زندگی گزارنے والوں کا حال لکھا ہے۔

دکھیارے

''دکھیارے'' از انیس اشفاق لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کی عکاسی کرتا ہوا یہ ناول جس میں انیس اشفاق نے بہت سادہ اسلوب زبان اختیار کیا ہے۔مصنف بہت خوبصورتی سے حال اور ماضی کے واقعات کو بیان کر رہا ہے اور ان واقعات کو حقیقت کے اس قدر قریب تر بتایا ہے کہ کہیں بھی کوئی جھول نظر نہیں آتا۔مصنف نے ذکر کیا ہے کہ غربت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ مکان کی قرقی ہو گئی ہے۔کرداروں میں ایک ماں اور اس کے تین بیٹے ہیں۔ایک بیٹا ذہنی عارضے میں مبتلا ہے جس کو جنونی کیفیت ہونے پہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ماں کو اپنی وحشت کا نشانہ بنا رہا ہے۔

مصنف نے ناول میں حالات و واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے باہم مربوط ایسے معلوم ہوتی ہیں کہ بات میں سے بات نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی مصنف حال میں بات کرتے کرتے اچانک بات کا رخ کچھ اس طرح سے موڑ دیتے ہیں کہ بات ماضی میں چلی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے خود ان سب حالات و واقعات کو قریب سے محسوس کیا اور پھر قلم کے ذریعے اس کو ہم تک پہنچایا۔

''ماں'' نے خود جس طرح حالات کا سامنا کیا اور اولاد کو بتایا نہیں کہ یہ مکان جس میں وہ رہتے ہیں ان کا نہیں ہے تو پہلی بار پتا چلنے پر احساس ہوا کہ اس بات کو چھپا کر خود تک رکھنا ماں کے لیے کتنا تکلیف دہ تھا۔ مکان کی قرقی ہونے پر راز افشاں ہوا کہ باپ نے یہ مکان گروی رکھا ہوا تھا۔ ماں نے جیسے تیسے مقدمہ لڑنے کی کوشش کی پر ایک اکیلی عورت کے لیے معاشرے سے جنگ لڑنا ممکن نہ تھا، وہ مقدمہ ہار گئی۔ اس کی ہار سے ہی ہم سب کو اندازہ ہوا کہ اب ہمیں اپنے گھر کی چھت نصیب ہونے سے رہی۔ ہم سب منت کے ٹھکانوں پہ گزارا کرنے لگے۔ ایک دن ماں کی طبعیت بگڑ گئی اور جب ماں کو ہسپتال پہنچایا گیا تو دو دن میں ہی ہمیں اس جہان میں اکیلا چھوڑ رخصت ہوگئی۔ جاتے ہوئے ماں نے کہا کہ بھائی کا خیال رکھنا۔ بھائی جو کہ ذہنی عارضے میں مبتلا تھے لیکن الٹ ہوا جو کہ بعد میں میرا خیال رکھنے لگے۔ کہیں کام بھی شروع کر دیا جس سے میری فیس بھی نکل جاتی اور گھر کا خرچ بھی نکل جاتا اور انہیں دیکھ کر مجھے وہ وقت یاد آتا جب ایک دن بھائی کو بہت غصہ آ گیا اور اسی غصے کی شدت میں آ کے انہوں نے لالٹین اٹھا کر ماں ہی کے سر میں زور سے ماردی۔ بھائی جو رقم کما کر لاتے لا کر ماں کو دیتے اور پھر اسی رقم کا مطالبہ کرتے۔ ماں سے اسی بحث کے دوران انہوں نے یہ سب کر دیا اور ماں شدید زخمی ہوگئی۔ انیس اشفاق لکھتے ہیں:

> ''ماں لالٹین جلانے سے پہلے صاف کر رہی تھی وہ بڑبڑاتے جا رہے تھے اور ماں ان کی باتوں کا جواب دینے کی بجائے لالٹین کی چمنی کے ایک مونہہ کو بند کر دوسرے مونہہ کی طرف پھونکیں مار کر ایک پرانے کپڑے سے گھما گھما کر صاف کر رہی تھی۔ بڑبڑاتے بھائی چیخنے لگے اور چیختے چیختے ماں کے قریب جا پہنچیا ور چمنی اس کے ہاتھ سے چھین کر

اس کے سر پر دے ماری۔ بھائی نے چمنی اتنی زور سے ماری کے ماں
اپنا توازن کھو بیٹھی اور زمین پر گر پڑی اور زمین پر گرتے ہی ماں
کے سر سے خون بہنے لگا۔''(23)

ماں کی موت کے بعد بھائی میں آنے والی تبدیلی چند ہی دن کی مہمان تھی۔ حالانکہ شروع میں ٹھکانے بدل بدل کر بھائی نے مجھے اپنے ساتھ رکھا لیکن پھر ان کی دماغی حالت پہلے جیسی ہوگئی اور ایک دن اچانک ہم تینوں بھائی الگ الگ رہنے لگے۔

مصنف نے تینوں بھائیوں کا قصہ کچھ اس طرح بتایا ہے کہ جب تینوں الگ الگ رہنے لگے تو بڑے بھائی کی کچھ خبر نہ ہوئی کہ وہ کدھر ہیں۔ پتا چلا کہ وہ عیسائیت میں داخل ہو گئے ہیں۔ ماں کی موجودگی میں بھی کئی دن تک بڑا بیٹا گھر سے غائب رہتا تھا۔ ایک خط چھوڑ جاتا تھا ماں کے لیے۔ ایسے ہی ایک دن وہ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی خط لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں بتاؤں گا کہ میں کہاں ہوں پر منجلیک بھائی سے ہوشیار رہنا کہ وہ تمہیں قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور ماں کی تمام چیزیں سنبھال رکھنا یہ خط موصول ہونے پر مجھے احساس ہوا کہ بھائی کی حالت درست نہیں مجھے انہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ بھائی کو دوبارہ جب پایا تو بچوں کو قرآن پڑھا رہا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کچھ دن کے لیے وہ عیسائی ہوئے تھے پھر مسلمان ہو گئے، مذہب اپنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ مصنف کی مشاقی پر اس وقت حیرت ہوتی ہے جب اپنے بھائی کی زندگی کے بیان میں حزن ہمیں زندگی کے قریب لے جاتا ہے۔

''کوئی بات تو ہے ان میں جو میں ان کے لیے پریشان رہتا ہوں، کیا
بات ہے؟ پتہ نہیں بس یوں سمجھو کہ وہ ان مریضوں میں سے نہیں
جنہیں معالج عزیز رکھنے لگتے ہیں۔''(24)

مصنف نے ناول میں ڈرامہ کی طرح کا منظر رکھا ہے۔ زیادہ تر وہ قارئین جو ناولوں میں ڈرامہ جیسی منظر نگاری کو پسند کرتے ہیں انہوں نے لکھنؤ کی تہذیب کو اپنے قلم سے محفوظ کیا ہے۔ دکھیارے کو پڑھتے ہوئے آپ کو پر پیچ واقعات سے نہیں گزرنا پڑتا۔ ایک سیدھی سادھی کہانی ہے جس میں کشش خود بخود ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ دو بھائیوں کا پیار اور ماں کا ساتھ نہ رہنا دل میں آنے والے

سوالوں کو دبانے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ ناول کو ایک ہی نشست میں پڑھ لیا جائے۔انیسویں صدی کے ناول دکھیارے کو پڑھ کر نثر کی بلندی کا پتہ چلتا ہے یقیناً یہ بہت بلندی کا حامل ہے۔

نادار لوگ

عبداللہ حسین کا یہ ناول "نادار لوگ" ایک تاریخی ناول ہے اور اس میں نو آبادیاتی عہد میں اقدار اور سماجی رویوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کے استحصال کو نمایاں کرنے کی ایک اہم کاوش ہے۔ پاکستان کی تاریخ ادب کے تناظر میں کیا تھی ،ہمیں ان کے اس ناول میں پتہ چلتی ہے۔ناول میں 1947ء کے بعد کے حالات وواقعات یعنی تقسیم کے بعد کن حالات سے گزرنا پڑا، کن واقعات کو برداشت کرنا پڑا اور وہ واقعات جو سیاست اور معاشرتی زندگی کی سطح پر رونما ہوئے اور ان کے کیا نتائج رہے یعنی لوگوں پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔انہیں ناولوں میں موضوع بنایا گیا ہے۔ملک کی آزادی سے لے کر بہت سے مسائل سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔

ایسے مسائل جنہوں نے پہلے ہی دن بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔مہاجرین جو در بدر ہو گئے تھے۔ان کی آبادکاری کا مسئلہ، اثاثہ جات کی تقسیم کا مسئلہ،اس کے علاوہ اقتصادی اور انتظامی مسائل ایسے مسائل تھے جن سے جڑیں کھوکھلی ہو گئی تھیں۔اس وقت جب کہ انصاف کی ضرورت تھی اس سے لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جب بدعنوانی کی گئی تو اس نے شروع ہی سے ملک میں ناانصافی اور بدامنی کے بیج بو دیے تھے جو کہ آج ایک تن آور درخت بن چکے ہیں۔جعلی الائمنٹ کا بازار گرم رہا اور حق تلفیاں ہوئیں جبکہ جاگیردار جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔انہیں پہلے سے بھی زیادہ خوشحال کر دیا گیا۔اس سے بدعنوانی کی جو فضا قائم ہوئی اس نے محکوم طبقہ کو بالکل کس مپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔خون کے وہ دھبے صرف کپڑوں پر نہ لگے تھے بلکہ دل و دماغ پر چھا گئے تھے۔ذہن معاؤف ہو گئے اور اپنوں کی بے بسی ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ ایک ایسی خلیج بڑھ گئی جس نے پاکستانی سماج کو بھی خاصا متاثر کیا۔

عبداللہ حسین نے بھی ناول میں نادار لوگوں کا ذکر کیا ہے۔کہانی کا تانا بانا اسی سیاسی وسماجی پس منظر میں تشکیل دیا گیا ہے۔''نادار لوگ'' کہانی کا آغاز ریل کے سفر سے شروع ہوتا ہے۔کہانی کا کردار سرفراز جو کہ میجر کے عہدے پر تعینات ہے۔سرفراز بہت چھوٹا تھا جب اس کے والد کا انتقال ہو

گیا۔سرفراز سے بڑا اس کا ایک بھائی ہے جو کہ سرفراز سے بڑا ہونے کی وجہ سے ساری ذمہ داری اس پر آ جاتی ہے۔اعجاز تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہے اور معلم کے فرائض انجام دے رہا ہے۔اعجاز ایک نرم دل انسان ہے اسی وجہ سے مزدوروں کی حمایت میں ہمیشہ سرگرم رہتا ہے۔ان کی حمایت میں مزدور یونین کے اراکین سے میل جول کی وجہ سے اعجاز سے استعفیٰ لے لیا جاتا ہے۔پھر اس کی زندگی مسلسل مسائل کا شکار ہو جاتی ہے۔کبھی جاگیرداروں کے مسائل تو کبھی کھیتی باڑی مزدور یونین المختصر اعجاز کی زندگی صرف سیاسی دباؤ کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔اس کی وفادار بیوی جو کہ ہر پل اس کے ساتھ ہے۔ہر طرح کے حالات میں زندگی میں آنے والے نشیب و فراز میں وہ اس کا ساتھ دیتی ہے۔

حالات صرف اعجاز کے لیے سازگار نہیں ہوئے بلکہ ان حالات کا سامنا سرفراز کو بھی رہا۔اعجاز اس کی تعلیم کا خواہش مند تھا مگر سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ایم کمیشن رپورٹ کو جواز بناتے ہوئے سرفراز کو ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔اعجاز کا واسطہ ایک جاگیردار جہانگیر سے پڑتا ہے جو کہ سماجی طبقہ کے ان لوگوں میں سے ہے جن کا کام ہی غریب عوام کا استحصال کرنا اور انہیں اپنے غلط ارادوں کے لیے استعمال کرنا ہے۔

کہانی کے دوسرے باب میں مصنف نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو کہ غریب ہیں اور امراء کے رحم و کرم پر پڑے ہوئے ہیں۔سکھوں کے فسادات اور جھگڑے جس میں غریب عوام پستی چلی گئی اور اُف تک نہ کر سکی کیونکہ انہیں اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی بھی اجازت نہ تھی۔انہی لوگوں کو عبداللہ حسین نے نادار لوگ کہا ہے۔ظلم و ستم کے ستائے ہوئے جن کو کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی، ایسا رستہ نہیں ملتا جس سے وہ ظلم و ستم سے فرار حاصل کر سکیں۔یوں ان نادار لوگوں کی زندگی میں آنے والے اتار چڑھاؤ سے اس کہانی کو تشکیل دیا گیا۔

اعجاز کا چھوٹا بھائی جب پیدا ہوا تب اس کی عمر پندرہ سال تھی۔یوں دوسرے بھائی کی ذمہ داری اپنے بڑے بیٹے پر چھوڑ کر ماں رخصت ہو گئی۔اعجاز پیسہ نہ ہونے کو غربت نہیں سمجھتا تھا۔اس کی نظر میں غربت کے اور کئی رنگ ہیں۔کہانی میں ایک جگہ وہ کچھ یوں بات کرتا ہے:

> ''سب سے بڑی غربت ذلت کی غربت ہوتی ہے۔ناطاقتی کی غربت، زیادتی کیسامنیپیضاعتی کی غربت، سمجھو کہ یہ غربت کا صدر

مقام ہے۔ پیٹ کا خلا کبھی نہ کبھی بھر جاتا ہے۔ ذلت کے داغ مرتے
دم تک سینے سے نہیں اترتے'' (25)

اعجاز ایک مثبت دل و دماغ کا مالک ہے جس کے دل میں ہر وقت اپنی امید کے بر آنے کا خیال قائم رہتا ہے۔ اس نے ہمیشہ غریب لوگوں کو پناہ دی اور یہی اس کی کامیابی کا سبب بنا۔ بعد کے حالات اسے سیاست کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک لوگوں کی بھلائی کے لیے خود کو اس آگ میں بھی جلنے دیتا ہے۔ وہ غریبوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور مختلف یونینز سے رابطے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ جس میں اس کو کامیاب دیکھ کر دشمن کو برداشت نہیں ہوتا تو اسے پھر سے پستی میں ڈالنے کے لیے اس کے کھیتوں میں ہل چلا دیتے ہیں مگر اس کے بعد بھی وہ نقصان سے دل چھوٹا نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ صنعت کاروں سے بدلہ لینے کے لیے اسے خود کو معاشی طور پر مستحکم رکھنا ہوگا۔ اس کے منشور میں بطور سیاست دان یہ بات شامل ہے کہ وہ غریب عوام کو استحصال اور محکومی سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے پارٹیوں نے منشور ضرور بنائے، پر ان پر کام نہ کیا۔ اعجاز ایک ایسے سیاست دان کے طور پر سامنے آیا جس نے سیاسی اجتماع میں قرار دادیں منظور کروائیں۔ ملاحظہ ہوں:

''آج سے۔۔۔ آج سے ہمارا مطالبہ ہے کہ کوئی حکومت اور کوئی لیڈر''
عوام'' کا لفظ استعمال نہ کرے، یہ دھوکہ دہی کا لفظ ہے'' (26)

سیاسی طور پر پس ماندگی کی ایک وجہ جو نظر آتی ہے وہ ہے سیاسی جوڑ توڑ۔ اگر کسی سیاسی جماعت کی اکثریت کو جوڑ توڑ کے ذریعے اقلیت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور اقتدار چھین لیا جاتا ہے تو اس بات کا سیدھا سیدھا مطلب یہی ہوتا ہے کہ عوام اور انتخاب کو رد کر دیا گیا ہے۔ اگر تاریخ میں نظر دوڑائی جائے تو اسی بات نے ملک کو خاص نقصان پہنچایا ہے۔ اسی رویہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اعجاز کا خون جوش مارتا ہے اور اس کا کردار غریب جو پسے طبقے کی فلاح و بہبود چاہتا ہے۔ وہ غریبوں کو سبز باغ ہرگز نہیں دکھانا چاہتا اور نہ ہی قول و فعل کے تضاد کے ساتھ انہیں تنگ کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود اعتمادی کا ضامن ہے اور اس کے علاوہ جہانگیر کا کردار جو کے عوام کا استحصال کرتا نظر آتا ہے۔ جعلی الاٹمنٹ کی صورت میں ملنے والی جاگیر کو غریبوں پر ظلم روا رکھنے کی رسم اور استحصالی رویے سے آج بھی چھٹکارا نہیں مل سکا

بلکہ اقتدار کے ایوانوں میں صرف چہرے ہی تبدیل ہوتے ہیں۔ جو یہ روایت ڈال دی گئی عوام آج تک اسی استحصال کا شکار ہے۔مصنف نے جہانگیر کے کردار کے ذریعے سیاسی چالبازی کو نمایاں کیا ہے۔ سیاست دان کا مطمع نظر صرف اور صرف اقتدار ہوتا ہے۔اپنا خیال عوام کا استحصال سیاست دانوں کا وطیرہ ہے۔بس اسی وجہ سے آج کی حکومت سیاسی اقتدار اور پیسے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس اعجاز کا کردار جو کہ حکومت کے رویے کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

> ''پچیس سال سے ہم حکومتوں کی بات سنتے آئے ہیں کہ یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا،ایسا کر دیں گے، ویسا کر دیں گے، یہ گا، گی گے سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔۔۔اس لیے ہمارا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ آج کے بعد کوئی حکومت یا لیڈر گا ، گی ، گے کے لفظ استعمال نہ کرے۔ یہ بھی دھوکہ دہی کے الفاظ ہیں۔'' آج کے بعد'' اعجاز نے کہا حکومت کے ہر بیان میں ''ہے'' کا لفظ برتا جائے گا یہ سچا لفظ ہے۔''(27)

انہوں نے ''نادار لوگ'' میں انسانی زندگی کے ان پہلوؤں سے نقاب سرکایا ہے جو کہ خفیہ ہیں۔سیاسی رویوں سے لے کر سماجی رویوں تک ہر ایک کو بے نقاب کرنے کی جسارت کی گیا ہے۔ہجرت کے وقت بہت سے لوگوں کو نا کامی کا سامنا رہا۔جوان کے پاس تھا وہ بھی لٹ گیا جس پر وہ لوگ آسرا کر کے بیٹھے تھے کچھ وہ لوگ ہاتھ صاف کر گئے۔جبکہ قوانین کے مطابق جنہوں نے ہندوستان میں اپنی جائیدادیں چھوڑی تھیں۔ان کو آگے چل کے جائیداد کا حصہ پاکستان میں سے ملنا تھا مگر ایسا نہ ہوا۔ یہاں پر موجود مہاجرین نے ان مہاجرین کا خوب استحصال کیا۔مصیبت کے مارے مہاجرین کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔جس کی وجہ سے ابتدا سے ہی لوگوں کو نا کامی کا سامنا رہا اور ملک میں غریب اور مفلوک الحال کی بنیاد رکھ دی۔

''نادار لوگ''میں بھٹہ مزدوروں سے جو اجرت کی جاتی ہے انہیں تو اس کا بھی علم نہیں ہوتا۔وہ اسے خرچے کا نام دیتے ہیں۔دن رات کی مشقت کے بعد بھی غریب طبقہ نسلوں کی غلامی میں جکڑا جاتا ہے۔وہ

سرمایہ داروں کی اجرت میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں اور خود غلامی کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ یہ نہ صرف ان کی جسمانی غلامی کی نشانی ہے بلکہ ساتھ ساتھ ذہنی غلامی کا بھی نتیجہ ہے کہ وہ صحیح اور غلط کی پہچان ہی بھول گئے ہیں۔ یہ سرمایہ دار کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ہر وقت انہیں ڈرا دھمکا کر یا بعض اوقات جسمانی تشدد کر کے بھی اپنا کام نکلوا لیتے ہیں۔ سبط حسین موسیٰ کارل مارکس کا ایک بیان ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محنت کاروں کو بازار کے بھاؤ سے جو اجرت ملتی ہے اس کے عوض وہ مقررہ وقت میں کئی گنا زیادہ مالیت کا سامان تیار کر دیتے ہیں لیکن ان فاضل محنت اور فاضل پیداوار کا انہیں کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ یہی قدر فاضل صنعتکار کے نفع، ساہوکار کے سود اور زمین کے مالک کے لگان اور کرائے کی شکل میں سرمایہ دار طبقے میں بٹ جاتی ہے''(28)

''نادار لوگ'' میں جس طرح پاکستانی سماج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس نے عبداللہ حسین کو ناول نگاروں کی صف اول میں لا کھڑا کیا ہے۔ مجموعی طور پر اگر جائزہ لیا جائے تو نادار لوگ ان ناولوں میں شامل ہوتا ہے جن میں تقسیم کے بعد کی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔

اردو ادب میں زندگی کی کئی صورتیں جیسے، اخلاق، تہذیب و تمدن، معاشرتی و سماجی آزادی، جنگیں، حسن و عقیدت، مجاز، کسی کلرک کا قصہ، کسی طوائف کی داستان، قتل و غارت، سیاسی نقطہ نظر، کسی قوم کی بہادری، کسی قوم پر عذاب، کسی طوائف کی عبرت کا نشان ادب کے وسیع کینوس پر ایسی لاکھوں تصویریں بنتی رہتی ہیں۔ ہر دور میں مختلف صورتحال پیش آتی ہے اور اسے مختلف طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ناول کے ذریعے ان خاموش لبھوں کو زبان ملتی ہے۔ وہ جذبات کھل کر سامنے آتے ہیں جن پر کوئی اظہار نہیں کر پاتا۔ وہ بے بس انسان جو گمنامی اور گمراہی کی زندگی گزار دیتے ہیں۔

ناول اظہار رائے کرنے کے لیے واحد تسکین کا ذریعہ ہے۔ حالات کو دونوں طرف سے سمجھنے کر، خاموش لبھوں کو زبان دینا یہ ادیب کا مقام ہے کہ بعض اوقات وہ ایسے حالات عیاں کر رہا ہوتا ہے کہ قاری کو لگتا ہے کہ یہ اسی کی زندگی ہے جو لکھی جا رہی ہے۔ معاشرے میں جنم لینے والے نئے نئے جرائم پس ماندگیوں کا سبب بنتے ہیں۔ قتل و غارت، چوری، ڈکیتی، خودکشی اور سرکوبی یہ تمام جرائم عام ہو جاتے

ہیں۔ادب کے ذریعے ادیبوں نے سماجی برائیوں اوران پس ماندگیوں سے پردہ اٹھا کرایک کاری ضرب لگائی ہے اور نا انصافی اور مساوی حقوق روا نہ رکھنے والوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔ادیبوں کے اسی رویے کی بنا پر''چے خوف'' نے کہا ہے کہ ادیبوں نے اپنے ساتھ بھی انصاف سے کام لیا ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ادیب ایک فن کار ہے وہ جو دیکھتا ہے،محسوس کرتا ہے،لکھتا ہے اوراس کے دیکھنے اور محسوس کرنے کا عمل سماج سے ہی وہ لیتا ہے۔اچھا ادیب صرف ادب برائے فن کو ہی نہیں سمجھتا بلکہ وہ ادب برائے ادب کا قائل ہوتا ہے۔وہ ادب کو زندگی کا ترجمان مانتا ہے۔

اچھا ادیب زندگی اوراس میں موجود پیچیدگیوں سے الجھا رہتا ہے۔ادب کی بنیاد بہر حال مادی،حقائق اور سماجی شعور کی وجہ سے مستحکم ہے۔اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ ادب تخلیق ہو۔شعور کی اس تخلیق کا نام ادب ہے جس میں ادیب مادی اور خارجی حقیقتوں کا عکس مختلف حدود و قیود کو مدنظر رکھتے ہوئے ،جمالیاتی تقاضوں کے مطابق پیش کرتا ہے۔یہ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ بالکل ساکن اور جامد ہو بلکہ متحرک ہو اوراس میں زندہ حقیقتوں کا ثبوت ہوتا ہے۔انسان نے جب قصے کہانیوں کی دنیا میں قدم رکھا یعنی جب وہ تہذیب وتمدن کے زینے چڑھنے لگا تبھی اس کی دلچسپی کا سامان سماج سے میسر ہوا۔اپنی روزمرزہ زندگی میں وہ جس طرح مسائل،کشمکش اور پھر اس سے نجات کے ذرائع اور وجوہات کو دیکھتا ہے تو وہ اسے ادب کے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔حیرت فن کی انتہا ہے اوراسی انتہا کی وجہ سے کہانیوں کا آغاز ممکن ہوتا ہے۔

شروع میں انسان کا ذہن پس ماندہ تھا وہ اردگرد کی پس ماندگیوں کو دیکھنے سے بھی قاصر تھا۔ یہ ادب ہی تھا جس نے انسان کو کامیابی کے رستے پر گامزن کیا اور آہستہ آہستہ یہ قصہ گوئی کی مدد سے ایک فن کی صورت اختیار کر گیا۔ناول کی صنف ہمارے ہاں مغرب اور بالخصوص انگریزی ادب سے مستعار لی جاتی ہے۔بہر حال اردو ناول کے ذریعے معاشرے میں جنم لینے والی پس ماندگیوں سے پردہ سرکایا گیا ہے اوراپنی اس کاوش میں ناول کامیاب رہا ہے۔ادیبوں کی کاوش سے معاشرے میں بگاڑ کے مسائل پر کافی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔بالکل درست کہنا ہے چے خوف کہ ادیب درست معنوں

میں قدیم زمانوں میں پیغمبر ہوا کرتا تھا اور عام لوگوں کی نسبت وہ زیادہ بصیرت وشعور رکھتا تھا۔انہوں نے ناداروں اور مفلسوں کی محرومیوں، ناکامیوں اور تکلیفوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں واضح ہے کہ ادیب کامیاب رہا ہے کہ ان کے جذبات عوام کے جذبات کے عین مطابق نظر آتے ہیں۔شاعروں نے بھی اپنے فکر وفن سے سماج میں ایک نئی روح پھونک کر تازگی کا احساس بخشا ہے۔شاعروں کی نسبت نثر نے زیادہ اس معاملے میں ترقی کے زینے چڑھے ہیں کہ وہ معاشرے میں ہونے والے بگاڑ کی صورت زیادہ واضح طور پر دکھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ادیبوں نے قومیت، آزادی اور مساوات کے حقوق یعنی برابری کو عوام تک پہنچایا ہے۔یعنی یہ بات درست ہے کہ ادیب اپنے سماج سے ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اسے متاثر کرتا بھی ہے۔قاری اگر ایک طرف ادیب کے نظریے سے خود کو ہم آہنگ سمجھتا ہے تو دوسری طرف وہ خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی بھی کوشش کرتا ہے اور یہی اردو ناول کی سب سے بڑی کامیابی اور مقصد ہے کہ وہ باشعور طبقے میں پس ماندگیوں کو کم کر سکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔صدیقی، عظیم الشان، اردو ناول۔آغاز وارتقا، عفیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، 2008، ص23

2۔فاروقی، محمد احسن، ناول کیا ہے؟، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، 2006، ص21

3۔اختر، سلیم، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009، ص486

4۔رام بابو سکسینہ (مرزا محمد عسکری متراجم) تاریخ بزم اردو، بزم خضر راہ، نئی دہلی، س ن، ص:47

5۔ناطق علی اکبر، نولکھی کوٹھی، بک کارنر، جہلم، اشاعت ہفتم 2021ء

6۔ناطق، علی اکبر، نولکھی کوٹھی، بک کارنر، جہلم اشاعت ہفتم 2021ء ص394

7۔تارڑ، مستنصر حسین، خس وخاشاک زمانے، سنگ میلی پبلی کیشنز لاہور 2010ء، ص15

8۔تارڑ، مستنصر حسین، خس وخاشاک زمانے، سنگ میلی پبلی کیشنز، لاہور 2010ء، ص34

9۔تارڑ، مستنصر حسین، خس وخاشاک زمانے، سنگ میلی پبلی کیشنز، لاہور 2010ء، ص515

10۔راس میکلی، دافلاسفی آف فکشن، ص39

11۔ذوقی، مشرف عالم، لے سانس بھی آہستہ روشن پرنٹرس، ص428، 429

12۔ایضاً،ص434

13۔ایضاً،ص465

14۔احمد عزیز،آگ،تخلیقات،لاہور،2000ء، ص78

15۔ایضاً،ص102

16۔ایضاً،ص8

17۔ایضاً،ص105

18۔گدی الیاس احمد،فائر ایریا،معیار پبلی کیشنز،نئی دہلی،1994ء،ص8

19۔گدی لیاس احمد،فائر ایریا،ص9

20۔ایضاً،ص8

21۔ایضاً،ص11

22۔ایضاً،ص52

23۔اشفاق انیس،دکھیارے،شیرزاد D-155،بلاک نمبر 5 گلشن اقبال،کراچی،2014،ص5

24۔ایضاً،ص7

25۔حسین،عبداللہ،نادار لوگ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،2014ء،ص317

26۔حسین عبداللہ،نادار لوگ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،2014ء،ص471

27۔حسین،عبداللہ،ص473

28۔سبط حسن،موسیٰ سے مارکی تک،کراچی،مکتبہ دانیال،اٹھارویں اشاعت،2014ء،ص14

☆☆☆☆☆☆☆

''نولکھی کوٹھی'' میں پس ماندگی کے مظاہر

علی اکبر ناطق کا پہلا ناول ''نولکھی کوٹھی'' جس نے اردو ادب میں ایک نئی تاریخ رقم کر دی ہے اور مصنف کی وجہ شہرت بنا۔ یہ ناول 2014ء میں سانجھ پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ ناول 448 صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول کے اب تک سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور انہوں نے ناول کا

انتساب اپنے ابا جان ''محمد بشیر'' کے نام کیا ہے۔

مصنف نے ناول کے ذریعے نہ صرف ادب کے معیار کو طے کیا ہے بلکہ ایک مختلف انداز میں یعنی روایتی انداز سے بالکل الگ ہو کر اسے پیش کیا ہے۔ناول نہایت دل فریب صورت میں اور دیدہ زیب انداز میں تحریر کیا گیا ہے، قاری ایک ہی نشست میں مکمل پڑھنا چاہتا ہے۔اس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

فکشن میں ان کا یہ قدم حیرت زدہ کرنے والا ہے۔نثر کو پڑھتے ہوئے ان کی مکالمہ اور بیانیہ پر مکمل گرفت کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہوئے ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہانی بالکل ویسی ہے جس میں قاری اپنا ماضی گزار چکا ہے۔وہ پڑھتے ہوئے خود کو اس کا ایک حصہ گردانتا ہے۔

اردو ادب ان سے جتنی بھی امیدیں وابستہ کر لے وہ غلط نہ ہوں گی۔ ہمارے دور کے ہو کر بھی انہوں نے نہایت ہی کمال طریقے سے ماضی کے ان واقعات سے پردہ اٹھایا ہے جنہیں ہم قصوں کہانیوں میں سنتے آئے ہیں۔

معاشرت کی خوبصورت انداز میں عکاسی کی ہے۔مصنف ناول میں پیچیدہ پہلوؤں کو سامنے لے کر آتا ہے۔ناول میں جس ''نولکھی کوٹھی'' کا ذکر کیا گیا ہے وہ اوکاڑہ میں واقع ہے۔اوکاڑہ میں ہی علی اکبر ناطق نے جنم لیا ہے۔انتظار حسین لکھتے ہیں:

> ''علی اکبر کا فکشن حقیقت اور کہانی کے پیچیدہ پہلوؤں کو سامنے لے کر آتا ہے۔وہ دیہات اور اس کے کرداروں کی بازیافت کا آدمی ہے اور حقیقی طور پر ''سن آف سوئل'' ہے۔ وہ احمد ندیم قاسمی کی طرح دیہات کا رومان پیش نہیں کرتا بلکہ اپنے کرداروں کو حقیقت کی زندگی عطا کرتا ہے''(1)

کہانی کا اصل موضوع ان کے شہر اوکاڑہ میں واقع نولکھی کوٹھی ہے جس کے پیچھے بے شمار حقائق ہیں اور کہانی کا مرکزی کردار ولیم اس کا وارث بتایا گیا ہے۔کیونکہ اسے یہ کوٹھی وراثت میں ملی

اور وہ اس کوٹھی سے بے حد محبت کرتا ہے۔ کہانی پڑھتے ہوئے جتنی سادہ معلوم ہوتی ہے اسی پل اتنی ہی پیچیدہ بھی معلوم ہوتی ہے، جب ایک کے بعد ایک پرت سامنے آتی ہے۔ اس ناول سے پہلے بھی تقسیم ہند کے موضوع پر بہت لکھا گیا ہے۔ ہر ایک نے تقسیم ہند کے موضوع کو ایک نئے انداز میں بیان کیا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ سب نے اپنے احساسات و محسوسات کے مطابق لکھا ہے۔

علی اکبر ناطق ان ناول نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے تقسیم ہند کو تو موضوع بنایا پر وہ تقسیم ہند سے خائف نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی کئی سالہ حکومت کا خلاصہ انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ نولکھی کوٹھی اس حصے میں تھی جو حصہ پاکستان میں شامل ہو گیا۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک انگریز ہے۔ وہ اپنی اس کوٹھی میں تا عمر رہنے کا خواہش مند ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی اپنی پہچان پر قربان کر دیتا ہے، مگر لوگوں کا تعصب آمیز رویہ اسے قبول نہیں کرتا اسے انگریز ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی نفرت کا سامنا رہا اور وہ خود کو ہندوستانی کہتا رہا مگر کوئی اسے اس کی پہچان کے ساتھ قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ کہانی تاریخی پس منظر میں تقسیم ہند کے گرد گھومتی ہے۔ اس لحاظ سے اسے تاریخی ناول کہا جا سکتا ہے۔ علی عباس حسینی اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''مسلمانی عظمت اور گزشتہ صولت کی یاد ایام ہمارے خونی اثرات میں، ہیجان پیدا کر کے ہمیں زندہ کرنے والی چیز ہے لیکن ساتھ ہی۔۔۔۔ وہاں پہنچ کر صرف باتوں ہی باتوں میں ٹالا جا سکتا ہے۔ آج جبکہ زمانہ صدیوں آگے بڑھ چکا تو آپ ہی بتائیے کہ ہمیں اگلوں سے تعارف کرانے کے لیے کیسے زبردست اور ہنر مند شخص کی ضرورت ہوگی۔ یعنی وہ صرف باتیں ہی نہ بنائے بلکہ ہماری روح کو ہٹا کر صدیوں پیچھے لے جائے اور وہاں کچھ اس طرح مصروف سیر رکھے کہ نہ تو جی گھبرائے اور نہ بجائے زندوں کے مردوں سے واسطہ پڑے۔''(2)

مصنف نے ناول میں ثقافت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ پنجاب کے مختلف علاقوں کی ثقافت،

مذہب، جاگیردارانہ نظام، حالات، رہن سہن، تقسیم کے دوران ہونے والی ملکی وغیر ملکی سازشیں اور ان کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ جن کو بیان کرنا بھی اذیت ناک رہا ہوگا۔ ان کا مداوٰی ناممکن بیان کیا گیا ہے۔ وطن سے محبت کا جذبہ ہر کسی میں پایا جاتا ہے۔ لیکن جو جذبہ اس نے مرکزی کردار ولیم کے ذریعے ہمارے ذہنوں تک پہنچایا ہے اس کا نقش مٹنا ناممکن ہے۔ ولیم جسے بے شمار مصائب کا سامنا رہا، بے شمار ٹھوکریں کھائیں، گھر سے بے گھر ہو گیا لیکن حوصلہ نہ ہارا خود کو اسی مٹی کے سپرد کر دیا جس مٹی سے اسے محبت رہی اور وفاداری کے ساتھ اپنی تمام تر محبتیں اپنی زمین پر لٹاتا رہا۔ مصنف نے کہانی کو اتنی مہارت سے لکھا ہے کہ کہانی کو پڑھتے ہوئے شروع سے آخر تک وہ قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔

پلاٹ

علی اکبر ناطق نے بہت ہی منظم انداز میں کہانی کے پلاٹ کو ترتیب دیا ہے۔ مسلمانوں ہندوؤں اور انگریزوں کی نفسیاتی کشمکش، کیفیات اس طرح جامع انداز میں منظر عام پر لے کر آئے ہیں گویا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں اس نیان تمام زندگیوں کو جیا ہے اور محسوس کرنے کے بعد اسے ناول کا رنگ دیا ہے۔ سکھ، انگریز، مسلمان اور جاگیرداروں کی چپقلش کو اس نے وہ عملی جامہ پہنایا ہے کہ گرفت بھی قائم رہتی ہے اور اس ہنرمندی نے پلاٹ کو منظم اور موپھط بھی کیا ہے۔

مرکزی کردار

مصنف نے ناول میں کرداروں کو اس طرح باہم گتھا بتایا ہے کہ سب آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ کوئی بھی غیر ضروری محسوس نہیں ہوتا۔ سب کردار اتنے جاندار اور متحرک ہیں کہ سب کے سب ہی مرکزی کردار معلوم ہوتے ہیں اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ ناول کا مرکزی کردار کون سا ہے۔ مگر چار ایسے کردار ہیں جن سے کہانی اختتام تک پہنچتی ہے۔ ایک اسسٹنٹ کمشنر ''ولیم'' جو کہ انگریز ہے۔ وہ خود کو ہندوستانی شناخت دینا چاہتا ہے اور آخری دم تک ناکام رہتا ہے۔ ایک جاگیردار ''حیدر'' جو اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے اور منفی کردار کے طور پر ناطق نے ''سردار سودھا سنگھ'' کو پیش کیا ہے۔ وہ ایک زمیندار ہے، سکھ ہے اور آخر میں

مولوی کرامت، جو کہ امام مسجد ہے، ان چاروں کرداروں کے گرد کہانی گھومتی نظر آتی ہے۔ مصنف ان چاروں میں ایک ربط قائم رکھتے ہوئے کہانی کو اختتام تک لے جاتا ہے۔ آغاز سے آخر تک اپنے اندر بہت سی ان کہی باتیں لیے ہوئے ہے جن کو قاری محسوس کرتا ہے۔ کہانی کے آغاز سے ہی جو داستان بیان کی گئی ہے وہ غلام حیدر اور سودھا سنگھ کی دشمنی کی ہے۔ پڑھتے ہوئے شروع میں یہ دونوں ہی مرکزی کردار معلوم ہوتے ہیں۔ پھر جب ''ولیم'' کا مضبوط کردار کہانی میں شامل ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں کی دشمنی سے الگ اپنی ایک ہی دھن میں نظر آتا ہے۔ وطن سے محبت، اپنی زمین سے محبت اور اسی زمین کو اپنی زندگی مانتا ہے اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کے بہت سے کردار حقیقت سے قریب ہیں۔ جیسے ''محمد علی جناح، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، نواب افتخار ممدوٹ'' اور ناول کے آخر میں مصنف خود بھی ناول میں موجود ہے۔ ناول ''نولکھی کوٹھی'' پر امتیاز احمد نے کالم لکھا، جس میں انہوں نے ناطق کے فن کو سراہا۔

> ''بلا شبہ و مبالغہ علی اکبر ناطق کو کہانی سنانے کا فن بخوبی آتا ہے اور وہ اپنے کرداروں کی نفسیات سے باخبر ہے۔ علی اکبر ناطق ناول نہیں لکھتا بلکہ ناول اسے لکھتا ہے'' (3)

مصنف کرداروں کے ذریعے انگریزوں، مسلمانوں اور سکھوں کی نفسیات کو عیاں کرتا ہے۔ انگریز افسران کا کردار ان کی نفسیاتی کشمکش، سکھ معاشرے کو اس انداز سے بیان کیا ہے جیسے کہ کوئی بات کرنے والا جز ہی نہ بچا ہو۔ اس نے صاف لفظوں میں جز سے کل کا کام لیا ہے۔ وہ کرداروں کے ذریعے معاشرے کی عکاسی کرتے نظر آتا ہے۔ کردار اپنے کردار میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے ہمارے ہی آس پاس کے رہائشی ہیں۔ ایک ایک کردار اپنے معاشرے کی پوری طرح سے نمائندگی کرتا ہے۔ مردانہ کرداروں کی بہتات ہے جبکہ خواتین کردار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ''ولیم'' کے ساتھ کیتھی کا کردار اور ''سودھا سنگھ'' کے ساتھ اس کی بیوی، ''حیدر'' کے ساتھ اس کی والدہ کا کردار سپورٹ کے لیے لکھے گئے ہیں۔ خواتین کی موجودگی ناول میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیتھی کا کردار ولیم کو سپورٹ اس طرح کرتا ہے کہ وہ اسے اس کی وطن سے والہانہ محبت کے ساتھ چھوڑ کر اپنے ملک واپس چلی جاتی ہے۔ جہاں ولیم کو اکیلے ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ وہ بیوی کی جدائی میں کم غمزدہ دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس

پہ وطن کی مٹی سے محبت کا جذبہ تمام کہانی میں غالب نظر آتا ہے۔ڈاکٹر نجم الہدی کی کردار اور کردار نگاری میں کچھ یوں کرداروں کے بارے میں لکھا گیا ہے:

''قصہ نگار اپنے جیسے لوگوں کے کرداروں سے کچھ معلومات فراہم کرتا ہے،لفظوں کو وسیلہ اظہار بناتا اور فنی خصوصیات کا التزام کرتے ہوئے کچھ ایسے اشخاص اپنے قصے میں پیش کرتا ہے جو عام انسانوں سے قدرے مختلف ہوتے ہوئے بھی ان سے ملتے جلتے ہوتے ہیں''(4)

کردار کہانی میں جاندار ہوں تو کہانی متحرک رہتی ہے اور کسی بھی کہانی کے عروج وزوال کا باعث بھی یہی کردار نگاری کہلاتی ہے۔نولکھی کوٹھی میں کی گئی کردار نگاری اس کے فن تخلیق کو عروج دیتی ہے۔ایک ایک کردار حقیقت کو اس طرح بیان کرتا رہا ہے جیسے وہ اس دنیا میں چل پھر رہا ہو۔

منظر نگاری

ناطق کی تحریروں میں پنجاب کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے وہ تحریروں میں ایسا پنجاب دکھاتے ہیں کہ قاری پنجاب کو محسوس کرنے لگتا ہے۔کھیت کھلیان، پنجاب کے گلی کوچے،فصلیں، رہن سہن المختصر پنجاب کی مکمل تصویر کھینچ دیتے ہیں اور پڑھتے ہوئے قاری کے دل و دماغ میں پنجاب کا نقش ابھرتا ہے۔

''گاؤں کے اردگرد زیادہ تر کمادہ ہری ہری برسن کے کھیتوں کے بیچ دور تک پھیلے ہوئے توریے کے زرد زرد پھول اور چری کی فصلیں تھیں۔ایک دو جگہ گڑ بنانے کے بیلنے لگے ہوئے تھے اور آگ پر چڑھی ہوئی گنے کی پت سے اٹھنے والی حرارت کی خوشبو ہوا میں گھل مل کر سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ کچھ سکھ گڈوں پر چارہ لاد کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔جگہ جگہ رہٹ اور کاریزیں تھیں جن کا شفاف پانی کھالیوں میں سے تیرتا ہوا توریے اور برسن کی فصلوں میں پھیلتا جا

رہا تھا۔اس کے علاوہ کھالیوں کے کناروں پر ٹاہلیوں اور پیپلوں کے
سایہ دار درختوں کی قطاریں آگے پیچھے جمی ہوئی تھیں۔فصلوں کی
سرسبزی اور پانی کی طراوت آنکھوں سے ہو کر دل میں اترنے
لگی''(5)

انہوں نے پنجاب کے حسن کا نقشہ کچھ اس طرح سے کھینچا ہے کہ قاری خود کو پنجاب کی گلیوں، کھیتوں میں چلتا پھرتا اور دل میں ایک ٹھنڈک کا احساس اترتا ہوا محسوس کرتا ہے۔آنکھوں کے سامنے ایک خوبصورت منظر پھر جاتا ہے۔

شاعرانہ رنگ

وہ بذات خود کیونکہ شاعر بھی ہیں اس لیے انہوں نے اپنے ناول میں نثر کے ساتھ ساتھ اپنی شاعرانہ طبیعت کو بھی زندہ رکھا ہے۔نثر میں ان کا انداز بہت سادہ اور صاف ہے۔نفیس طریقے سے لکھے گئے جملے سیدھے دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔بالکل ویسے ہی جیسے ان کے دل و دماغ سے نکلے ہوئے ہوں۔

اپنی شاعرانہ طبیعت کے پیش نظر انہوں نے اپنی تخلیقی قوتوں سے ناول میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں اور ناول کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور ناول میں جہاں جزئیات نگاری سے کام لیا گیا ہے۔طوالت کو مدنظر رکھا گیا ہے وہاں شاعری سے ٹھنڈی ہوا جیسی طراوت محسوس ہوتی ہے۔ نولکھی کوٹھی میں شامل ایک نظم،جس نے سارا ماحول بدل کر رکھ دیا،اس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

"نومبر ہمیشہ اداس ہوتا ہے
رکا ہوا،مطمئن اور بے نیاز
اس کی وادی میں صبح ہوتی ہے،دوپہر سہ پہر
پھر شام آجاتی ہے
مگر دھوپ کا مزاج نہیں بدلتا
آسمان کی طرح پروقار بزرگی والا

زندگی نومبر کی طرح نہیں
زندگی بدلتی ہے، متواتر بدلتی ہے
وہ تجھے نومبر میں نہیں رہنے دے گی
دھوپ غبار آلود ہو جائے گی
صاف نظر آنے والی چیزیں دھندلا جائیں گی
پھر سیاہ ہو جائیں گی
پھر اندھیرا کھا جائے گا
اس وقت جب میں نہیں ہوں گا
دوست کوشش کرنا نومبر نہ گزرے
مگر یہ وہ کوشش ہے جس کا حاصل خسارا ہے''(6)

انہوں نے بہت کم عرصے میں اپنا مقام حاصل کیا ہے اور یہ ایک یقینی بات ہے کہ اس وجہ سے ان کے بے شمار مخالف بھی ہوں گے۔ اس مخالفت کے باوجود بھی ان کی تخلیقات پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اندرون و بیرون ممالک دونوں میں ناطق کو مخالفت کا سامنا ہے۔ ان کی تخلیقات پر ناقدین کی خاص توجہ ہے۔ اردو ادب میں وہ اپنا نام بطور شاعر اور افسانہ نگار پہلے ہی پیدا کر چکے تھے مگر ناول لکھنے کے بعد جس طرح سے فکشن میں انہوں نے اپنے آپ کو متعارف کروایا ہے اور چند دنوں میں ہی ترقی کا سفر طے کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ بڑے بڑے تخلیق کار اور نقاد ان کے معترف ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر ناطق صاحب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''علی اکبر ناطق نے نسبتاً دیر سے لکھنا شروع کیا لیکن جب لکھنا شروع کیا تو مسلسل لکھا۔ صرف آٹھ برسوں میں نظموں کے دو مجموعے، ایک ناول اور افسانوں کے دو مجموعے اور ان دونوں کے انگریزی تراجم شائع ہو چکے ہیں۔''(7)

اردو ادب میں مصنف نے نثر سے اپنے لیے جو جگہ بنائی وہ قابل بیان ہے۔ وہ قاری کو اپنا

دوست بنا لیتے ہیں اور اپنے فن سے اسے ایک الگ دنیا میں لے جاتے ہیں۔ جہاں قاری کو دنیا میں ہونے والے وہ واقعات جو پس پردہ ہیں انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

پس ماندگی کے مظاہر

ناطق کے پاس علم کا وسیع خزانہ موجود ہے۔ جب ان کا ناول ''نولکھی کوٹھی'' میں نے پڑھا تو مجھے بھی اس بات سے اتفاق ہوا کہ واقعی ناطق ایک انوکھے شخص ہیں جو علم وحکمت کی دولت سے زرخیز ہیں۔ پنجاب کی مٹی سے ان کو لگاؤ نہیں بے حد لگاؤ ہے۔ بہت سادگی سے کہیں دل کی بات کہہ دی تو کہیں انتہائی پیچیدگی سے معاملے کو پیش کیا۔ اپنی ہی ذات میں مست ایک انسان جو کہ بس لکھتا ہے۔ کبھی لفظوں کو شاعری کا رنگ دیتا ہے تو جب کبھی جذبات سنبھالے نہ جائیں اور لکھنے کے لیے شاعری سے زیادہ وسعت مانگیں تو انہیں نثر میں مانند گوہر سمو دیتے ہیں۔ تحریر میں جگہ جگہ جزئیات سے جو کام لیا گیا ہے۔ ہر بات کو کھل کر بیان کیا گیا، ہر معاملے اور واقعے کے پیچھے کے اسباب وحقیقت کو کھل کر بیان کرنا بھی کبھی ناممکن نظر آتا ہے۔ مگر نولکھی کوٹھی کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ یہ بات بھی اب ناممکن نہیں رہی۔ ناطق نے ناول میں تقسیم کے بعد کے نقصانات کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ تقسیم سے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ جب تقسیم ہند کے واقعات کو پڑھتے ہیں تو ان کا مخصوص لب ولہجہ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے، مولویوں پر نشتر چلاتے نظر آتے ہیں جو کہ طنز سے بھرپور ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر انہوں نے جو کارنامہ سر انجام دینے کی سعی کی ہے وہ ایڈمنسٹریشن سسٹم کی حقیقت بیان کی ہے۔ انہوں نے ناول کو صرف اس لیے نہیں لکھا کہ پڑھنے کے بعد انہیں نقادوں اور ادیبوں سے داد یا تنقید ملے۔ بس وہ کھلے دل کے، اپنی طرز کے واحد آدمی ہیں جنھوں نے ناول صرف اس لیے لکھا ہے کہ پڑھنے والے کہ دل میں پنجاب کی ثقافت اور علاقائی مناسبت کا مکمل نقشہ ابھر آئے اور ایسا ہی محسوس کرے جیسے ناول لکھتے وقت خود ان کے جذبات تھے۔ بہت شدت سے دل میں ظفر اقبال صاحب کی ان کے لیے لکھی وہ لائن جگہ بنا گئی۔ ظفر اقبال نے علی اکبر کے فن کو سراہتے ہوئے نولکھی کوٹھی پر کالم لکھا جس میں وہ کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی"(8)

اس مصرع نے گویا دل ودماغ پر اثر کیا بالکل ایسے ہی محسوس ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی بات

نہیں ہوسکتی تھی جو دریا کو کوزے میں بند کر سکے۔ ناول پڑھتے ہوئے ایسے بہت سے مقامات پر احساس ہوا جہاں وہ پسماندگیوں کو بیان کر رہے ہوں کہیں غربت افلاس کو لے کر جبری تشدد اور مشقت اس کے علاوہ طاقت کا زور، غریب کی آواز کو دبا دینا، حاکم اور محکوم میں فاصلہ، گورنمنٹ کی نظر میں اعتبار حاصل کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں کو آزمانا، زمینداروں کا قانون ہاتھ میں لینا، کلرکوں کا اپنے کام میں ناانصافی کا مظاہرہ کرنا، طاقت کے آگے بلند حوصلوں کا پست ہو جانا، غریب یا کم ہمت لوگوں کے لیے تھانیداروں کا غیر مناسب رویہ، پرچہ کاٹنے سے انکار کر دینا، ذاتی عناد اور مفاد پر لڑائی جھگڑے، کاروائی کرنے پر تبادلے کے احکامات جاری ہو جانا، ملاؤں کا وسیع پراپیگنڈا، رشوت لینا، افسروں کا دبدبہ اس طرح کے بے شمار پس ماندگی کے مظاہر اپنی تحریر میں عیاں کیے ہیں۔ جن سے معاشرے میں ہمیشہ بگاڑ رہتا ہے۔

غربت و افلاس، جبری مشقت اور تشدد

ایک ان پڑھ اور غریب معاشرہ کبھی بھی ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے بڑھتی ہوئی روز بروز سماجی تفریق اور غربت معاشرے میں ناسور کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ معاشرے کا ایک طبقہ اگر زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے سے محروم رہتا ہے تو غربت کسی بھی معاشرے میں اس سماجی تقسیم کا نام ہے جس میں ایک گروہ خوب ترقی کی منزلیں طے کرے تو دوسری طرف دوسرا گروہ مسلسل غربت و افلاس سے تنگ و تاریک زندگی گزارنے پر مجبور ہو۔ کیونکہ اختیارات رکھنے والے کبھی بھی تنگ و تاریک زندگی گزارنے والے سفید پوش لوگوں کو ان کا حق نہیں دیں گے۔ لوٹ کا بازار ایسا گرم ہے کہ مردہ ضمیر لوگ یہ بھول بیٹھے ہیں کہ ایک نوالہ ان کے لیے وجہ رحمت بن سکتا ہے۔ غربت کی اسی رفتار کو ماپتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ نوجوان نسل اور بچے اس غربت کا شکار ہو رہے ہیں۔ بھوک سے تنگ انسان خوشحال و مطمئن زندگی نہیں گزار سکتا، وہ محروم ہے ہر اس پل سے جسے وہ سوچ کر خوش بھی نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے بھی اس درد کو محسوس کیا اور ناول نولکھی کوٹھی میں اس کو اپنا موضوع بنایا۔

مولوی کرامت کا گھرانہ جو پچھلے تیس سال سے چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ گاؤں کی آبادی سو پچاس گھروں پر مشتمل تھی۔ مولوی کا دادا بھی جب اس گاؤں میں آیا تو گداگری اور چندے سے کام چلاتا تھا۔ تب گاؤں کی مسجد خالی پڑی تھی۔ اس نے ادھر ہی گڈری جمالی اور نماز پڑھنے لگا۔ شروع

شروع میں لوگ غربت کو مدنظر رکھتے ہوئیترس کھا کر روٹی دے دیتے تھے۔ دیکھا دیکھی گاؤں کے کچھ لوگوں نے اس کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اس طرح وہ مسجد میں رہنے لگا۔ اس کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری کرامت علی کے باپ اور باپ کے بعد کرامت علی کو ملی۔ یوں نسل در نسل وہ دن اور آج کا دن یہ لوگ یہاں رہنے لگے لیکن غربت نے دامن نہ چھوڑا۔

''مولوی کرامت گھر سے نکلا تو اس کے قدم سیدھے نہیں پڑ رہیتھے۔ بار بار عصا پر دباؤ بڑھ جاتا اور سر میں شدید درد تھا۔ معدہ خالی ہونے کی وجہ سے اس میں تبخیر پیدا ہو چکی تھی۔ اسے رہ رہ کر فضل دین پر غصہ آ رہا تھا۔ جو ابھی تک روٹیاں لے کر نہیں آیا تھا۔ مولوی کرامت کو ڈر تھا، نماز پڑھاتے ہوئے گر ہی نہ پڑے۔ صبح کے وقت ایک گلاس گڑ والی لسی پی کر ظہر تک نبھانا بہت مشکل تھا۔ اس لیے نماز کے دوران وہ پتہ نہیں کیا پڑھتا رہا۔ بلکہ ایک دفعہ تلاوت کرتے ہوئے کسی جگہ کی آیت دوسری جگہ پڑھ گیا۔''(9)

ادھر فضل دین جو گھر گھر سیر روٹیاں اکٹھی کر کے نکلا تھا وہ الگ ہی مسئلے سے دوچار تھا۔ لوگ اسے روٹیاں دینے کے عوض گھنٹوں کاموں میں مصروف رکھتے، ذاتی کاموں میں جن کے بعد ہی اسے سوکھی روٹیاں لے جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ عام طور پر والدین جو خود غربت کا شکار ہوتے ہیں اور اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دے پاتے تو وہ بچوں پر بہت ذمہ داری ڈال دیتے ہیں۔ غربت کے شکار والدین یا وہ جو خود کمانے کے قابل نہ ہوں ایک سے زیادہ افراد کنبہ کی کفالت کی ذمہ داری ہو تو وہ بھی اپنے بچوں کو کم سنی میں ہی ، زبردستی رزق کی تلاش میں سخت کاموں کے لیے زندگی سے لڑنے بھیج دیتے ہیں اور یہ مسئلہ خطرناک حد تک بڑھ کر اس وقت سامنے آتا ہے جب معصوم بچوں سے جبراً مشقت کے علاوہ جنسی استحصال کیا جانے لگتا ہے۔ ملازمت کے دوران بلاوجہ بعض اوقات ان کو چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنف نے بھی کرامت علی کے بیٹے فضل دین کے کردار کو بطور نمونہ پیش کیا ہے کہ جب وہ گھر گھر روٹیاں لینے جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا حالات درپیش رہتے ہیں۔

''اماں لوگ کام لینا شروع کر دیتے ہیں۔فضل دین منہ بسورتے ہوئے بولا، میں کیا کروں؟ انکار کرتا ہوں تو روٹیوں کا تھیلا اتار کر رکھ لیتے ہیں۔تب مجھے بات ماننی ہی بنتی ہے۔کون کون ایسا کرتا ہے؟ شریفاں نے فضل دین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔اماں! ملک نظام کی بڈھی حاجن مجھے گھنٹہ گھنٹہ کام میں لگائے رکھتی ہے۔یہ سب دیر اسی وجہ سے ہوتی ہے۔وہ سارے گھر کے کام اکٹھے کر کے میرے انتظار میں رکھ چھوڑتی ہے، بس جاتے ہی کام پر لگا دیتی ہے۔زیادہ دیر تو وہیں ہوتی ہے۔''(10)

فضل دین جب وہاں سب کام کر کے گھر سوکھی روٹیاں لے کر آتا تو گھر پر کرامت علی کے غصے کا نشانہ بنتا۔کرامت علی کے مطابق فضل دین اپنا وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتا تھا اور گھر کی فکر نہیں کرتا اس لیے گھر اور باہر دونوں طرف سے ہی فضل دین کو اپنی کم عمری کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔یہ معاشرتی پس ماندگی ہے غربت وافلاس کی اوٹ میں دکھاوا کرنا، مدد کے نام پر غریب کا استعمال کرنا اور اسی معاشرتی برائی سے معاشرے میں جبری مشقت اور جنسی تشدد جیسی پس ماندگیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

طاقت کا زور، حاکم اور محکوم میں فاصلہ

ہمارا ہمیشہ سے یہ المیہ رہا ہے کہ ہم اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا فانی ہے۔ہر شے زوال پذیر ہو جائے گی۔پھر بھی قوت واقتدار کے ملتے ہی ہم خود کو طاقتور گردانتے ہوئے اپنی زندگی کو حقیقت سے دور لے جاتے ہیں۔ماضی کے دریچوں سے اگر جھانکیں تو بے شمار ایسے واقعات ملیں گے مگر عصر حاضر میں بھی اس میں شدت بڑھتی ہی گئی۔خاص طور پر مشرقی ممالک میں حاکم اور محکوم کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے ہیں کہ جس کے نتیجے میں عام عوام کے خواب کانچ کی مانند ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ایسے چکنا چور کے جن کے شیشے آنکھوں اور ہاتھوں کو مزید چھلنی کر جاتے ہیں۔دل میں نئی نئی امنگیں امیدیں سر اٹھاتی ہیں اور بالآخر گمنامی میں گم ہو جاتی ہیں۔دل میں ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے،

کاش یہ اقتدار رکھنے والی قوتیں اس احساس کو ہمیشہ دامن گیر رکھتیں کہ اقتدار صرف اور صرف ایک ڈھلتے سائے کا نام ہے۔ اقتدار نہ رہے گا تو خود کی زندگی بھی پھر دل میں آخری خواہش کی طرح سسکی کے ساتھ دم توڑ دے گی۔ کاش وہ دن جان پاتے کہ اقتدار ایک آفتاب لب کوہ کا نام ہے۔ یہ حاکم ومحکوم کے درمیان فاصلے آشوب قیامت برپا کیے ہوئے ہیں۔ اقتدار رکھنے والی مقتدر قوتوں کو یہ علم ہونا چاہیے کہ عوام کی فلاح واصلاح ہی ان کے اقتدار کا واحد جواز ہے۔ انہوں نے بھی کہانی میں کچھ اس طرح ہی حاکم ومحکوم کے فاصلے کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح انگریزوں کی حکومت رہی، ہندو اور مسلمان جو کہ آپس کے جھگڑوں میں بھی انگریز حکومت کے پابند تھے اور انگریز حکومت فیصلہ صادر کرنے میں ہی خود کو برتر سطح پر رکھتے۔ انگریز حکومت کا خیال تھا کہ اگر ہر بار مقامی لوگوں کو میل جول کے لیے آسانی فراہم کی تو وہ اس طرح ہیبت سے باہر نکل جائیں گے جو کہ انگریز سرکار قائم رکھنا چاہتی ہے۔ انگریزوں کے مطابق اس طرح ان کا قانون جو ایمپائر کا حقیقی ستون ہے۔ دیسی لوگوں کے سامنے چھوٹا پڑ جائے گا۔

> ''ولیم حاکم اور محکوم میں ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ اسے قائم رکھنا حاکم کی ذمہ داری ہے۔ دیسی لوگوں کو انصاف فراہم کرو لیکن عدل کے دوران تمہارا ظالم اور مظلوم سے فاصلہ برابر ہونا چاہیئے۔ ان کے درمیان فیصلہ کر کے دونوں سے بے تعلق ہو جاؤ۔ اگر مقامی سے سو دفعہ ملو تو ہر بار اجنبی کی طرح کیونکہ تمہاری قربت اسے تمہاری ہیبت سے باہر کر دے گی اور یہ قانون کو چھوٹا کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہی قانون جو ہماری ایمپائر کا حقیقی ستون ہے۔''(11)

انگریز حکومت اپنی بقا کے لیے ہر وقت ہوشیار اور متحرک رہنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو صاف منظر نہیں دیکھنے دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دونوں ہماری حکومت پر اعتبار کریں اور کسی طرح یہ اعتبار قائم رہے تب تک جب تک ہم خود اپنے پاؤں نہ جما لیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ دونوں قومیں اپنے آپ میں ایک بڑی طاقت رکھتی ہیں۔ دونوں کا مل جانا بھی انگریز حکومت کے لئے خطرے کا باعث ہوتا اور دونوں میں اس حد تک فساد اور لڑائی جھگڑے بھی انگریز حکومت کے

لیے باعث راحت نہ تھے۔اس لیے وہ ہوشیاری کو اپنا شعار بنا کر چلتے رہنا چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب ہیلے نے ولیم کو سمجھایا تو اس نے کچھ یوں ذکر کیا کہ ہندوستان میں پنجاب واحد ایسا علاقہ ہے جہاں انسان اور جانور ایک ساتھ رہتے ہیں۔وہ صاف لفظوں میں انسانوں کو جانوروں سے تشبیہ دے رہا تھا اور ان کی طاقت کا اعتراف بھی کر رہا تھا۔اس نے نہایت ہی کھلے لفظوں میں اظہار کیا کہ کس طرح انگریزوں نے دو قوموں کو آپس میں بیوقوف بنا رکھا تھا۔

ہیلے کا ایک جملہ کہ یہ دونوں قومیں ایک وقت میں اگر بھینس کی طرح ہیں اور اگر ان سے اختلاف رائے بڑھ جائے تو ایک دم سرکشی بیل بن جاتے ہیں اور لڑنے کے لیے میدان میں اتر آتے ہیں۔سکھ قوم کو تو انگریز احمق جبکہ مسلمان قوم کو وہ خطرناک سمجھتے تھے۔سکھ اپنا نقصان کر کے انگریزوں کے لیے مفید جبکہ مسلمان انگریز کے ہر کام میں اپنی مداخلت کر کے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ ہیلے کا جملہ ولیم کو سمجھانے کے لئے اور سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ ان قوموں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تھپکی دینا اور سرکشی کریں تو سینگوں سے دور رہنا، انگریز ایک عیار قوم ہے۔ناطق نے جملہ بندی سے اس بات کو ثابت کر دیا۔ناول میں ایک جگہ انگریزوں کی عیاری کا خلاصہ یوں کرتے نظر آتے ہیں:

> ''مجھے نہیں معلوم ہمارے مرکز میں کتنی طاقت ہے۔لیکن تمہارے ہیٹ کی چوڑائی پگڑی سے زیادہ ہونی چاہیئے اور سگار کا دھواں حقے سے تلخ۔تم ان کی آنکھوں میں دھواں بھرتے رہو تا کہ یہ صاف نہ دیکھ پائیں۔اس کے بعد جو تمہاری عینک انھیں دکھائے، یہ وہیں دیکھیں لیکن دھواں تمہاری اپنی آنکھوں کی طرف نہیں آنا چاہیے''(12)

مسلم طبقے کو مصنف نے ناول میں رعب و دبدبے اور غیرت والا بتایا ہے جو صرف غیرت کے لیے لڑتے ہیں، ذاتی مفاد کو ترجیح نہیں دیتے، اس لیے جب غلام حیدر نے اپنے ملازم کے قتل کا بدلہ لیا تو اس میں بھی ایسی عیاری سے کام نہیں لیا جس سے دوسرے کا نقصان ہوتا۔شیر حیدر نے اپنا ایک رعب و دبدبہ رکھا ہوا تھا جس کے لیے اسے کبھی بھی لڑائی کر کے اپنا رعب جمانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

جلال آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں دور دور تک شیر حیدر کی بہادری کا طوطی بولتا تھا۔شیر حیدر کے تعلقات چھوٹے بڑے تمام زمینداروں اور نوابوں سے تھے جہاں دوسرے لوگ انگریز کا نام سن کر حیرانگی میں چلے جاتے تھے۔وہاں شیر حیدر انگریزوں سے ذرا کم ہی رابطہ رکھتا تھا۔شیر حیدر زمیندار تھا اور اس کے زیادہ تر حریف سکھ ہی تھے۔لیکن سکھوں نے بھی کبھی سامنے آ کر وار نہ کیا تھا سوائے سودھا سنگھ کے،سودھا سنگھ کے ساتھ دشمنی پچھلی دو نسلوں سے چلتی آ رہی تھی۔دشمنی کے باوجود بھی سودھا سنگھ شیر حیدر پر کبھی سبقت حاصل نہ کر سکا کیونکہ طاقت میں شیر حیدر سودھا سنگھ سے زیادہ ہمت والا تھا۔

> ''شیر حیدر جلال آباد کے تین گاؤں کا مالک تھا۔جلال آباد میں اس کی ذیلداری کسی بھی شک وشبے اور چیلنج سے بالاتر تھی۔خاص تیس چالیس آدمی ڈانگ برچھی سے لیس اس کے ڈیرے پر موجود رہتے لیکن عموماً وہ لڑائی سے پرہیز ہی کرتا۔کوشش یہی ہوتی کہ معاملہ صلح صفائی سے حل ہو جائے۔ویسے بھی اتنی بڑی طاقت سے مخالفین دبکے رہتے اور بات آگے نہ بڑھ پاتی۔اس کے علاوہ شیر حیدر کو انگریز سرکار سے جو ذیلداری کا پروانہ ملا ہوا تھا وہ بھی کم نہ تھا۔''(13)

یقیناً یہ معاشرتی پس ماندگی ہے۔طاقت کا زور دکھانے والے مظلوم کو پیس کر رکھ دیتے ہیں اور مظلوم بیچارہ حاکم تک اپنی آواز کی رسائی کے انتظار میں ہی اپنے انصاف کی خواہش کو اپنے اندر دبا دیتا ہے۔یہ بے بسی معاشرے کو کھوکھلا کر رہی ہے اور عوام انصاف سے محروم زندگی گزارنے پہ مجبور ہے۔

قانون کے ساتھ بڑے لوگوں کا کھلواڑ

مصنف نے ایسے طبقے کا ذکر کیا ہے جو ان لوگوں کو راضی رکھنا فرض سمجھتے ہیں جن سے ان کو کام رہتا ہے۔زیادہ تر گورنمنٹ کو راضی کرنے کے لیے گاؤں کے لوگوں کو نواب اور ذیلدار خود ہی اپنے طور طریقے سے سنبھال لیتے ہیں اور اس بات کی خبر بھی گورنمنٹ کو لگنے نہیں دیتے۔اس طرح کچھ کو تو انصاف مل جاتا مگر زیادہ تر لوگ اپنی بات کو دل میں ہی دبا کر صبر کر لیتے ہیں۔نواب اور ذیلدار بھی اپنی اپنی ذات میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں کے سپرد اپنی رعایا کر دیتے ہیں۔

اس طرح غریب کی آواز گورنمنٹ تو کیا خود نواب تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔ مصنف نے اس درد کو محسوس کیا کہ لوگ کس طرح اپنے حق کے لیے بھی آواز نہیں اٹھا پاتے اور اپنے حق سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ معاشرے میں مختلف طبقات کا ہونا بھی ایک حقیقت ہے۔ یہ ایک بہت بڑی سچائی ہیکہ دنیا اختلاف رائے پر قائم ہے۔ ہر کوئی مختلف ہے رنگ، نسل، زبان، عقائد، امیر، غریب، چھوٹا، بڑا، مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے مختلف قبائل کے لوگ ریگستانوں، دریاؤں، پہاڑوں، میدانوں کے باسی اور سب سے اہم مختلف نظریات اور گروہوں کی شکل میں مختلف سیاسی پارٹیوں اور مختلف قائدین سے وابستہ لوگ۔ اس سب کے باوجود ان کو جو چیز آپس میں ایک رکھتی ہے وہ ہے ان کا آپس میں اعتماد و یقین، ادارہ یا ورملکی حکومت اس چیز کی ضامن ہوتی ہے کہ رویے انصاف پر مبنی ہوں اور یہی انصاف پر مبنی رویے ہی مضبوط معاشرے کی بنیاد بنتے ہیں۔ مگر وہاں جہاں کوئی ایک گروہ سرکش ہو جاتا ہے تو وہ اپنی اجارہ داری کی صورت میں سارا نظام خراب کر دیتا ہے۔

گورنمنٹ کو بے خبر رکھتے ہوئے مختلف طریقوں سے اپنا مفاد اور دوسروں کے لیے لاتعلقی کا رویہ اپنا لیتا ہے۔ وہاں معاشرہ ریت کی طرح بکھرنا شروع ہو جاتا ہے جہاں اعتماد ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر عوام کا اعتماد مجروح ہو جائے اور حکومت بھی انصاف کا ترازو چھوڑ فریق کی صورت اختیار کر لے، ادارے حصہ دار بن جائیں تو مضبوط سے مضبوط دیوار بھی گر جاتی ہے۔ مصنف نے بھی کچھ ایسے ہی طبقے کا ذکر کیا ہے جہاں پر وہ لوگوں کو بہت مجبور دیکھتا ہے۔

> ''عمومی طور پر قتل اور ڈکیتی کی واردات کے علاوہ اتنے بڑے رقبے میں رہنے والی رعایا سے گورنمنٹ بے نیاز سی ہو جاتی۔ ویسے بھی بڑے زمیندار کچھ تو اپنی ذیلداری کا بھرم رکھنے کے لیے اور کچھ گورنمنٹ کی نظروں میں اعتبار پانے کی غرض سے اپنی رعایا کے فیصلے عام طور پر خود ہی عدل سے چکا دیتے اس لیے زیادہ تر ایسے علاقوں میں امن و امان ہی رہتا۔ یا اگر کسی کے ساتھ زور زیادتی ہو بھی جاتی تو وہ صبر کر لیتا اور گورنمنٹ تک بات کم پہنچتی''(14)

سچ یہ ہے کہ انسان نے ہر طرح کے معاملات میں زندگی گزاری ہے۔ وہ انسان مبنی معاشرہ سے لے کر ان ادوار میں بھی زندگی گزار چکا ہے جب ظالم اور جابر حکمران بادشاہ ہوتے تھے۔ ہر دور میں زندگی جینے کے لیے انسان نے مختلف جتن کیے ہیں۔ اگر اس دور کی بات کی جائے جب انسان جنگلوں میں زندگی گزارتا تھا تب کوئی ذات پات کی تقسیم نہ تھی، کوئی امیر غریب نہیں تھا، طبقاتی کشمکش کو تب ہی عروج ملا جب انسان زرعی معاشرہ میں داخل ہوا۔ انسان قبیلوں میں بٹ گیا، زیادہ سے زیادہ کے حصول نے لالچ دلوں میں بھر دیا، بغض کینہ نے ہمدردی کی جگہ لے لی، اجارہ داری اور قبضہ قائم ہوا، امیر، غریب، چھوٹا، بڑا اور آقا غلام کی تقسیم کا رواج قائم ہوا۔

شیر حیدر کی وفات کے بعد دشمن نے دیکھا کہ بیٹا اکیلا رہ گیا ہے اور غلام حیدر کو کوئی تجربہ بھی نہیں تو دوسرے ہی دن کمزور جانتے ہوئے انہوں نے کھیتوں پر حملہ کر دیا۔ کہانی میں اصل دشمنی کا آغاز یہاں ہی ہوا۔ رات کے اندھیرے میں مکئی کا اجاڑا کر دیا اور جاتے جاتے خاص وفادار ملازم چراغ کو بھی قتل کر گئے۔ غلام حیدر سے چراغ کا قتل برداشت نہ ہوا اور انتقام کی آگ اس کے اندر بھڑک اٹھی۔ چراغ نے آخری دم تک لڑنے کی کوشش کی پر وہ اکیلا بیچارہ کسی طور بھی معاملے کو سنبھال نہ سکتا تھا۔ دوسرے ملازم نیاز حسین کے ذریعے جب ساری بات غلام حیدر کو پتہ چلی، ملازم جیسے جیسے واقعہ سناتا گیا غلام حیدر کے چہرے کے تاثرات بدلتے گئے۔ شدید غصے کی حالت میں کپکپی طاری ہو گئی۔ واقعے کو مصنف نے بالکل ایسے بتایا ہے گویا غلام حیدر اسی وقت غلام کا انتقام لینا چاہتا تھا اور غلام حیدر قانون کو نظر انداز کر کے دشمن کو منہ زور جواب دینے کے لیے بالکل تیار تھا اور رفیق پاؤلی کو ایک دم اٹھ کر کہا:

> ''سودھا سنگھ کو کیا پیغام دوں؟ رفیق پاؤلی نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ یہی کہ سکھڑے اب واہگرو سے جو مدد مانگتا ہے مانگ لے کیونکہ موت اسے اب زیادہ مہلت نہیں دے گی۔ غلام حیدر نے غصے سے شدید نفرت پیدا کرتیہوئے کہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ میں تیرے واہگرو کو بھی دیکھ لوں گا'' (15)

ناطق نے قانون کو ہاتھ میں لینے کے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری پر ایک ہیبت طاری رہتی ہے، اب اگلے پل کیا ہونے والا ہے اور اسی ہیبت کو مصنف نے پس ماندگی بھی ظاہر کیا ہے کہ کس طرح معاشرے میں زمینی خداؤں کا اضافہ روز بروز ہو رہا ہے جو قانون کو ہاتھ میں لینا باعث فخر سمجھتے ہیں۔

کلرکوں کا غیر منصفانہ رویہ

مصنف نے ناول میں ایسے کلرکوں کا ذکر کیا ہے جو سالہا سال سیٹ پر براجمان رہتے ہیں اور کام بھی کوئی نہیں کرتے۔ ولیم ایسے کلرکوں کو سخت ناپسند کرتا تھا اور بات بہ بات وہ اپنے کلرک نجیب شاہ کو اس کے حلیہ کے بارے میں آگاہ کرتا رہتا تھا۔ مگر نجیب شاہ پہ اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ ولیم کا خیال تھا کہ شاید پندرہ سال کے بعد تمام کلرک ایک جیسے ہی دکھنے لگتے ہیں۔ مصنف نے دونوں کرداروں کے ذریعے کلرکوں کا طریقہ کار بتایا ہے۔ ان کا رہن، سہن آدھے سر سے گنجے پیٹ ضرورت سے زیادہ باہر جو مسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے باہر نکل آیا ہوا تھا، عینک کے شیشے موٹے موٹے جو کہ کبھی صاف بھی نہیں کرتے یا پھر سرکا تیل عینک کے شیشوں کا دھندلائے رکھتا ہے۔ یا کچھ اس طرح سے مصنف بات کو رخ دیتے ہیں کہ کلرک چاہتا ہے کہ عینک صاف نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ بے رونق چہرہ ایک تو ایماندار نہ ہونا اور دوسرا چہرہ مسلسل استرے کے استعمال سے اس قدر سخت کہ کراہت کا احساس ہوتا ہے اور سب سے زیادہ کراہت کا احساس تب ہوتا ہے جب ناک کے بال بھی نتھوں سے باہر جھانک رہے ہوتے ہیں۔ کلرک دیہی علاقوں میں یہ عہدہ سرکاری ملازمین کی نچلی سطح پر ہوتا ہے۔ اگر برطانوی حکومت کی بات کی جائے تو انھیں ولیج افسر کہا جاتا تھا اور یہ انتہائی بااثر ہوتے تھے کہ تاریخ میں یہ لوگ حکومت کے لیے کان اور آنکھ کا کام کرتے تھے۔ دیہات میں زمینی کاروائی اور دیکھ بھال والا ہوتا ہے۔ ماضی میں بھی یہ لوگ اتنے بااثر رہے ہیں، موجودہ صورتحال میں بھی انہیں زیادہ اثر ورسوخ مل گیا ہے اور یہ لوگوں کا ایسے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

گاؤں میں ان کا ردعمل اس طرح کا ہے جس کی لاٹھی اسی کی بھینس جس نے جتنا زیادہ چارا ڈال دیا ادھر کا رخ کر دیا۔ یہاں تک کہ بات بن جانے پر اس بات کو روک کر رکھنے اور مظلوم کی بے بسی

کا مزہ لینے پر بھی قادر ہیں۔ دوسروں کے ساتھ کیے گئے کسی بھی دوسرے غلط اور غیر منصفانہ رویے کی بھی قیمت لیتے ہیں اور بعض اوقات ان کا ایسا غیر منصفانہ رویہ غریب کو موت کے منہ تک لے جاتا ہے۔

''اکثر فائلوں کے کیڑے مگر ان کا مطالعہ ہمیشہ عینک کے شیشوں سے اوپر کی طرف کرتیہیں۔ کند ذہن اور پرلے درجے کے کمینے، کام روکے رکھنے کے ماہر اور صاحب بہادروں سے زیادہ چھوٹے اور بڑے چوہدریوں کے وفادار۔''(16)

ناول میں مصنف نے جگہ جگہ کلرکوں کے غیر منصفانہ رویوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ولیم کے کردار کے ذریعے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش بھی کی ہے اور اس کوشش میں ولیم کو ناکام بھی دکھایا ہے کہ بہت کوششوں کے بعد بھی وہ نجیب شاہ کی عادات کو نہیں بدل سکا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ جالے دیواروں پر نہیں بلکہ خود ان کے ذہنوں اور ان کی سوچ پر لگ چکے ہیں۔ جو کہ اب کبھی ہٹ نہیں سکتے۔ ایک مردہ ضمیر کی زندگی کچھ ایسی ہی ہوگی جسے یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ اس کے مردہ ضمیر کی وجہ سے کتنی زندگیاں جینا چھوڑ گئیں ہیں۔

دوسری طرف مصنف نے وہ وجہ بھی بتائی ہے کہ جن کی وجہ سے ان کلرکوں کے دل مردہ ہو جاتے ہیں اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کام سے زیادہ اپنے سے اوپر طاقت رکھنے والوں کے وفادار ہوتے ہیں، چوہدریوں کے تعلقات جو کہ افسران بالا ہیں۔ ہزاروں لاکھوں فائلیں دفتروں میں ایسی ہی پڑی رہ جاتی ہیں کلرک کی لاپرواہی سے یا پھر چوہدریوں کے رعب سے بلکہ جالے ان فائلوں پہ اس طرح لگے ہوتے ہیں کہ جیسے اب آئندہ بھی ان کو کوئی ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرے گا۔ زمین کے خدا بنے بیٹھے یہ لوگ احساس سے عاری ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کو غلط درست کی پہچان بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ولیم بھی کچھ ایسی ہی کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح سے کلرکوں کی ان عادات کو بدل سکے مگر وہ جانتا تھا کہ یہ مٹی ان پہ ہمیشہ کے لیے پڑ چکی ہے۔

''اس کے علاوہ آفس کی ہر چیز سے ایسی وحشت ٹپکتی تھی جسے دیکھ کر ولیم کو گھن آنے لگی۔ چیزیں، کرسیاں، قلم دان، پردے حتیٰ کہ دروازوں

کی کیلیں تک زنگ آلود ہو چکی تھیں۔ جنھیں آتے ہی ان نے بدل دینے
کا مکمل ارادہ کر لیا۔ مگر وہ ان کلرکوں کا کیا کرتا، جن کے چہروں پر آفس
کی کھڑکیوں سے زیادہ جالے پڑے تھے'' (17)

کلرکوں کے اس رویہ پہ ناطق سخت نالاں نظر آتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ ان کی سفا کی اور درندگی کی وجہ سے عوام اپنے حق سے محروم زندگی گزارتی ہے اور کچھ تو اس بات سے بھی لاعلم رہتے ہیں کہ شاید ان کے ساتھ ان کی کسی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ کلرک اس قدر اپنے رویے سے انسان کی سوچ مفلوج کر دیتے ہیں۔

ذاتی عناد اور مفاد پر لڑائی جھگڑے

ہمارے معاشرے کو آج پہلی ضرورت تو یکجہتی کی ہے۔ خود غرضی، قتل و غارت، لوٹ مار انتشار اور خلفشار کو ختم کرنے کے لیے انسانی یکجہتی کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہمیں اپنے مفاد اور دشمنی کو بھلا کر ملک کا سوچنا ہوگا۔ ذاتی عناد کی خاطر جب ہم دوسروں کی خوشیوں کو قربان کر دیتے ہیں تو گویا ہم اس راستے پر چل نکلتے ہیں جو منزل سے محروم ہے، کٹھن سفر مقدر بن جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتحاد، ایمان، اتفاق اور یکجہتی انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ہمیں اس کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ اس سے ہی تہذیب، وجود اور سماجی نظام نشوونما پاتے ہیں۔ مگر اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ اتحاد ہی ہمارا ترقی کی طرف پہلا قدم ہے ہم بدقسمتی سے ایسے معاشرے کا حصہ ہیں جہاں یکجہتی کا فقدان ہے۔ خوشیوں سے محروم انسانوں کے مسائل سے قطع تعلقی کی وجہ سے یہ خامی جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔

دنیا کی تمام اقوام و مذاہب میں یہ شرف سب سے پہلے دین اسلام کو حاصل ہے جس نے یکجہتی کا درس دیا ہے۔ بلاتفریق اسلام نیا نسانی برادری اور مذہب وملت کا وہ نقشہ کھینچا ہے جس پر سچے دل سے عمل کیا جائے تو یہ ذاتی عناد اور مفاد پر لڑائی جھگڑے کرنے والی دنیا جنت کا منظر پیش کرنے لگے۔ ہمیں خود اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ ہم ہی دست وباز و اور شریک کار ہیں جو انتشار کی وجہ بنے ہیں۔ اس معاشرتی پس ماندگی کو ختم کرنا ہوگا اور اس کے لیے بھی ہمیں خود ہی کوشش کرنا ہوگی۔ اقتدار

کے نام پر اور دوسروں سے اختلاف کے چکر میں ہم ذاتی دشمنیوں کو ہوا دیتے ہیں اور ایک ایسی آگ جلا دیتے ہیں جس کی لپیٹ معاشرے کو اپنے اندر لے لیتی ہے۔ ایک دوسرے کو منافق اور ملحد ہونے کے طعنے دیتے ہیں۔ اس طرح سازشی عناصر ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کی صورتحال مصنف نے ناول میں تحریر کی ہے۔ فیروز پور کا علاقہ جس کی وضاحت اس طرح سے کی ہے کہ جہاں فصلیں کم اگتی ہیں اور برچھیاں زیادہ اور ان کا معزز ترین پیشہ چوری اور ڈاکہ زنی ہے۔

مسلمان اور سکھ دونوں یہاں بستے ہیں اور دونوں ہی ذاتی لڑائی میں اپنے خدا اور گرو جی کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ یہ ان کے خون کی گردش ہے جو ان کو گرمائے رکھتی ہے۔ یہ سکھ ہندو کی ذاتی دشمنی ہی تھی۔ دونوں قتل و غارت میں گھروں کی بربادی نہیں سوچتے تھے۔ سکھ چاپلوسی اور عیاری میں ماہر تھا اور مسلم اپنی غیرت کے نام پر بدلہ لینے میں۔ چراغ کے قتل کے بعد غلام حیدر نے بھی اسی غیرت کا مظاہرہ کیا کہ بدلہ ہر حال میں لینا ہے۔ وہ خون معاف نہیں کرے گا۔ اور بات بڑھتے بڑھتے قتل وغارت پہ جا کر ختم ہوئی۔ سودھا سنگھ کا غلام حیدر کے گاؤں پر حملہ کرنا سکھ مسلمان کا روپ دے کر چودھراہٹ کے لیے کی گئی۔ جس کا انجام انتہائی خوفناک رہا:

> ''سر پہلے تو لڑائی ذاتی عناد اور فرد کے مفاد سے شروع ہوتی ہے مگر سکھ اور مسلمان دونوں عقل سے زیادہ جذبات میں پلتے ہیں۔ اس لیے یہ لڑائی فوراً کسی ایک کے نعرے کی بنیاد پر مذہبی روپ لے لیتی ہے۔''(18)

غلام حیدر ایک غیرت مند کردار ہے جس کی ایک ہی بات ہیکہ وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی رعایا کو یتیمی کی زندگی بسر نہیں کرنے دے گا۔ وہ اپنے باپ کی طرح لڑائی جھگڑوں سے دور رہنا چاہتا تھا مگر پھر جب سیاست کے پہیے میں آیا تو گول گول گھومتا ہوا خود کے ہاتھ بھی خون سے رنگ بیٹھا اور اپنے کام کو، اپنی بات کو پورا کرنے کے لیے ہر حد پار کر گیا۔ وہ بھی اپنے پورے رعب وجلال میں آ گیا۔ کچی عمر کا لڑکا اب ایک منجھا ہوا آدمی لگنے لگا اور بھانپ بھانپ کر قدم اٹھانے لگا۔ معاملے کو سمجھا اور بہت ہی ہوشیاری کے ساتھ اس نے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

غلام حیدر نے پہلے پرچہ کٹوانا مناسب سمجھا تا کہ قانونی کاروائی مکمل رہے۔لڑائی جھگڑے کے معاملات میں رپورٹیں سب سے زیادہ درج ہوتی ہیں اور انہی معاملات میں رپورٹس کو بدل بھی دیا جاتا ہے۔ جو جتنا گڑ ڈالتا ہے اتنا ہی میٹھا ہوتا ہے۔اس مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ جس مخالف میں زیادہ طاقت تھی اس نے اتنا ہی زور مارا اور خود کو بچانے کی کوشش کی۔سودھا سنگھ دشمن دار تھا اور آسانی سے ہاتھ آنیوالا نہیں تھا۔تھانیدار تک ٹال مٹول سے کام لیتے تھے کہ پرچہ نہ کاٹا جائے۔لیکن غلام حیدر نے بھی بھروسہ کرنے کی بجائے معاملے کو خود ہاتھ میں لیا۔ناول نگار نے اس المیے پر روشنی یوں ڈالی ہے۔

> ''میرا مطبل ہے کہ یہ سودھا سنگھ پر سیدھا الزام ہے جو عدالت میں ثابت نہیں ہوگا۔خواہ مخواہ قتل ضائع ہو جائے گا۔ ویسے بھی قتل والی رات سودھا سنگھ شیخوپورہ گیا ہوا تھا۔(داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میں قتل کے اگلے دن سے ہی سارے معاملے کی تحقیق کر رہا ہوں۔واہگرو کی سونہہ ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں بیٹھا۔دیکھیں سردار جی! غلام حیدر نے زور دیتے ہوئے کہا عصر کا وقت ہو گیا ہے اور میں دشمن داری والا بندہ ہوں، وقت بالکل نہیں ہے، کیس خراب ہوگا تو میرا ہوگا، عدالت میں ثابت ہوگا تو ہمارا نقصان ہوگا لیکن میرا ملزم سردار سودھا سنگھ ہے آپ پرچہ کاٹیں''(19)

ناول نگار نے کچھ اس طرح سے ہماری توجہ اپنے خیالات کی طرف مبذول کرائی ہے کہ اب تماشہ شروع ہوگا جس میں مدعی اور مجرم دونوں ذلیل ہوں گے اور مفاد پرست پارٹی فائدہ اٹھا جائے گی اور ایسے حالات جن میں رپورٹ تھانیدار نے درج کرنی ہوتی ہے وہ رپورٹ درج کرانے والے کو کھلے دل سے بے عزت کر سکتے ہیں۔

پولیس بظاہر انصاف دلانے والی ہوتی ہے مگر ایسے حالات میں جب ان کی اپنی نہیں چلتی کہ کس طرف رخ کیا جائے تو مالی فائدہ کو سرفہرست لے آتے ہیں۔اس پرچے میں وہ جج خود بھی ہوتے

ہیں اور دونوں طرف آگ لگانے والے بھی ہوتے ہیں اور اگر کسی نے ضرورت سے زیادہ خوش کر دیا تو اسے بچانے کے لیے ایسی ایسی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں کہ مجرم بھی خود کو ایک فرشتہ صفت انسان سمجھنے لگتا ہے اور ایسا کیس آگے عدالت میں پہنچنے سے پہلے ہی فیصلہ کروا چکا ہوتا ہے کہ مجرم باعزت بری ہو جائے گا۔ تھانیدار نے جب غلام حیدر کی بات کو سننے سے انکار کیا اور ٹال مٹول سے کام لیا تو غلام حیدر کو بھی اپنا اصلی روپ دکھانا پڑا۔

ناول نگار نے غلام حیدر کے ذریعے معاشرے میں ہونے والے اس غلط فعل کا روپ بے نقاب کیا ہے جس نے معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کر لینی چاہیئے اور غلام حیدر نے ایسا ہی کیا تھانیدار بھانپ گیا کہ لڑکا خالی نہیں ہے۔ اس حوصلے اور جگر سے بات کرنا، آج تک گورنمنٹ میں دو پھولوں والے تھانیدار سے اس طرح مخاطب ہونے کی کسی کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ ناول نگار نے بتایا کہ کس طرح سیاسی دباؤ کے نیچے گورنمنٹ کو دبا لیا جاتا ہے اور ایک عام آدمی بھی اپنی ہیبت سے اپنا ذاتی کام اپنی من مانی سے کروا جاتا ہے۔

> ''دیدار سنگھ نے غلام حیدر کو دلاسے کی شکل میں بات سمجھانے کی کوشش کی مگر یہ جملے سن کر غلام حیدر کے تیور بگڑنے لگے اور وہ تلخی سے بولا، سردار جی آپ کی داڑھی کی مٹی میں نکال دوں گا، میرے پاس بہت بندے ہیں، وہ ساری جھاڑ پونچھ کر دیں گے۔ جو کام تمہارے کرنے کے ہیں وہ تم کرو۔ اگر آج تم پرچہ نہیں کاٹو گے تو آج کے بعد میں تھانے نہیں آؤں گا۔ رشوت کی بھینسیں سودھا سنگھ نے آپ کو بھیجی ہیں مجھے نہیں۔ یاد رکھو پرچہ کٹے گا تو سودھا سنگھ پر ورنہ میں لاہور تک جاؤں گا اور یہ دونوں پھول تارے وردی پر نہیں رہیں گے۔ چراغ دین کا قتل کوئی اندھا نہیں ہیکہ کوئی تھانیدار بھی پی جائے''(20)

ناول نگار نے بات کو صرف یہاں پر ختم کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ جس خوبصورتی سے مدعی اور مجرم کی جنگ بتائی ہیو ہاں اس حقیقت کو بھی آشکار کیا ہے کہ پہلے تو بدقسمتی سے کوئی اس طرح کے کیسوں کو

ہاتھ نہیں ڈالتا مگر جب کوئی نیک صفت اس کیس کی طرف اپنا دھیان کرتا ہے تو اسے بھی جڑ سے اکھاڑ دینے کے درپے ہوجاتے ہیں۔ اس میں صرف مجرم ہی ہاتھ پاؤں نہیں مارتا بلکہ بعض اوقات تو اوپر سے ہی اس کے تبادلے کا حکم نامہ جاری کروادیا جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں ہر کوئی طاقت کے سر پر اپنا لوہا منوا سکتا ہے وہاں ہر کوئی ہی مدعی ہے، مجرم کوئی بھی نہیں، ہر کوئی ہی حق پر ہے۔ سب اپنا دھونس جمانا اپنا عین حق سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا ناول کے کردار ولیم کو بھی رہا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ معاملہ اب سلجھ جائے اور اس کی مکمل انکوائری کرنا چاہی۔

وہ اس معاملے کو کیوں نہ سمجھ سکا۔ وہ اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے اس کی نظر دوبارہ دیوار پر لگی تحصیلداروں کی تصویروں پر پڑی۔ ان تحصیلداروں کی تصویریں آویزاں تھی جو یکے بعد دیگرے جلال آباد میں پوسٹ کیے گئے اور اب اس پر ساری حقیقت عیاں ہو چکی تھی۔ ناول نگار کے مطابق ولیم جیسا انسان جو ایمانداری سے کام کرنا چاہتا تھا اور جب وہ مسلسل کام پر دھیان دینے لگا کہ آخر سودھا سنگھ پکڑ سے کیوں باہر ہے تو اسے احساس ہوا کہ پہلے دن جب اس نے اپنے کمرے میں تصویریں دیکھی تھیں اور یکے بعد دیگرے ان کی جلال آباد میں پوسٹنگ ہوئی تھی اس کے پیچھے بھی یہی راز تھا کہ ان لوگوں نے بھی یہاں کے نوابوں اور ذیلداروں کے مطابق کام کرنے سے انکار کیا ہوگا اور ان کے لیے تبدیلی کے حکم نامے جاری کروادیے گئے ہوں گے۔

> ''اس نے سوچا شاید نئے افسران کیساتھ ایسا ہوجاتا ہے، انہیں کافی عرصہ تک باور نہیں آتا کہ وہ افسران بن چکے ہیں۔ اسی لمحے اسے خیال آیا اس کی اپنی تصویر بھی اب یہاں آویزاں ہوجانی چاہیے، یہ خیال آتے ہی وہ ہلکا سا مسکرادیا پھر آگے بڑھ کر گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا'' (21)

تصویر آویزاں ہوجانے سے مراد کہ اب مصنف کے مطابق اس افسر کے تبادلے کا بھی وقت آ گیا ہے۔ تصاویر کا وہاں موجود ہونا اور پھر بھی حالات کا نہ بدلنا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ تصاویر میں موجود لوگوں نے جب حالات کے درست کرنے کی کوشش کی ہوگی تو تبادلے کے آڈر آ گئے ہوں گے۔

رشوت ستانی

رشوت ستانی ایک جرم ہے۔ایسا جرم جو مجرم کو امید دیتا ہے بلکہ یقین کہ وہ بالکل بے قصور ہے۔اس میں ایک فرد کی تیسرے فریق کو عام طور پر جو کوئی اتھارٹی رکھتا ہے، (کسی سرکاری بندے کو یا نجی ادارے) کو رشوت دیتا ہے تا کہ وہ اس کے ذریعے فائدہ اٹھا سکے۔اس طرح وہ رقم مختلف قسم کے تحائف، جاندار یا بے جان تحائف یا مختلف اقسام کی صورت میں دی جا سکتی ہے۔صرف اور صرف ذاتی مفاد کے لیے اگلے کو خوش کر دینا بلکہ اس کے گلے میں اپنی رشوت کے ذریعے گھنٹی باندھ دینا۔رشوت دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ رشوت لینے والا ایسی کاروائی کرے اور ایسا کیس بنا کر پیش کرے جس میں قانون کو بھی اندھا ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہے اور معاملہ فرد کے حق میں ہو جائے۔بعض اوقات رشوت دینے کا مقصد خود کو ٹھیک ثابت کرنے کا نہیں ہوتا بلکہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم پر حکومت کرنے والے ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جائیں اور ہر عمل سے پہلے رشوت دینے والے کا سوچیں۔

ایک مستقل سرگرمی جس میں اگلے کو اپنا غلام بنا لیا جاتا ہے، اسی کی وجہ سے معاشرتی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج ہر شعبہ زندگی میں سفارش، رشوت اور لوٹ مار کا بازار گرم نظر آتا ہے۔دوسروں کی دل آزاری کرنا، اس کی حق تلفی کرنا نہ صرف حقوق العباد کی نفی کرتے ہیں بلکہ اس کے ذریعے ہم حقوق اللہ سے بھی انصاف نہیں کرتے۔افسوس صد افسوس اسلام کے معیار کو بھلا کر معاشرے کی اقداروں کو نظر انداز کر کے آج ہم اس رشوت جیسے جرم کو مزید اضافے کی طرف لے جا رہے ہیں۔

کرپشن کے لیے راہیں ہموار ہم نے خود کی ہیں، لوگوں کو ناجائز طریقے بھی ہم نے خود سکھائے ہیں اور اس برائی کا شکار بھی ہم خود ہی ہیں کیونکہ ہم فرد کو معاشرے سے کاٹ نہیں سکتے۔ناول نگار نے بھی کہانی میں کرداروں کے ذریعے اس معاشرتی پس ماندگی کو عیاں کیا ہے۔ناول نگار کرداروں کے ذریعے ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ جن گوشوں پر اس کی ڈالی ہوئی تفصیل کی روشنی نہیں پڑتی وہ بھی قاری پر اجاگر ہو جاتے ہیں۔

''کیا اس بارے میں تم نے ہمیں رپورٹ دی؟ ولیم کا لہجہ انتہائی سخت

ہو چکا تھا، یا تم سمجھتے ہو کہ سودھا سنگھ کو گرفتار کرنا تمہارے لیے برا شگون ہے کیونکہ غلام حیدر نے تمہارے لیے کبھی دیسی شراب کے مٹکے نہیں بھجوائے'' (22)

غلام حیدر کو اس بات کا اندازہ پہلے سے ہی تھا کہ پرچہ کٹوانے کے باوجود بھی سودھا سنگھ کبھی بھی پولیس کی گرفت میں آنے والا نہیں۔ اس لیے اس نے صرف پرچہ ہی کٹوایا مگر اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اس کو یہ بھی پتا تھا کہ سودھا سنگھ سب خرید چکا ہے ورنہ اسے پرچہ کٹوانے میں اتنی بحث نہ کرنی پڑتی۔ وصول کنندہ ہی اس معاملے میں ایمانداری دکھاتا ہے رشوت لینے کے بعد کام کو روک دینا۔ ناول نگار نے بھی یہ واضح کیا ہے کہ جب لوگوں کے جائز حقوق سیدھے طریقے سے نہ ملیں اور انصاف معاشرے سے ختم ہو جائے تو رشوت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ رشوت نہ صرف لینے دینے والے کو برباد کرتی ہے بلکہ اس کے اثرات پورے ملک وملت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ جس جگہ رشوت اپنا ڈیرہ جما لیتی ہے اس جگہ سے امن وامان ختم ہو جاتا ہے۔ کسی کی جان وعزت محفوظ نہیں رہتی کیونکہ وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔

رشوت لینے اور دینے والا دونوں ہی جہنم کی آگ میں جلتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو ہم جان جائیں گے کہ یہودیوں میں مختلف برائیاں فروغ پاتی رہیں اور کرپشن کو بھی عروج ملتا رہا۔ رشوت ایک ایسی نحوست ہے جو ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، قوم کو کھوکھلا کر کے غیروں کا خوف خود پر مسلط کر دیتی ہے اور اپنوں میں انتشار پھیلا دیتی ہے۔ غلام حیدر نے بھی جب پرچہ کٹوایا تو اسے ان ہی حالات کا سامنا رہا:

''پھر اب کیا ارادہ ہے؟ نجم علی نے پوچھا، پرچہ درج کرایا؟ پرچہ تو درج کرا دیا ہے۔ غلام حیدر نے بتانا شروع کیا۔ پر نجے لگتا ہے کہ سودھا سنگھ کے ہاتھ لمبے ہیں۔ تھانیدار سے لے کر اوپر تک سب اسی کے کنویں سے پانی بھرتے ہیں۔ ابا کیا فوت ہوا سب نے نظریں پھیر لیں۔ اب تو خبر ہے کہ چوہے بھی شراب کے مٹکوں سے نکل نکل

کر سامنے آرہے ہیں''(23)

ناول نگار نے رشوت کے بارے میں بات کرتے ہوئے تفصیلاً روشنی جو ڈالی ہے وہ ''ملک بہزاد'' کے کردار کے ذریعے ڈالی ہے۔ملک بہزاد ایک پکا کھاتڑی ہے اپنے وقت کا اور شیر حیدر کا جگری یار۔اس رشتے سے ہی غلام حیدر اسے چچا کہتا ہے۔غلام حیدر نے جب خود کو اکیلا محسوس کیا تو ملک بہزاد نے ہی اس کا ساتھ دیا تھا۔ملک بہزاد کے مشوروں پر چل کر ہی غلام حیدر نے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ملک بہزاد نے غلام حیدر کو سمجھایا کہ قانون کے پیچھے جانا چھوڑ دے،اگر قانون نے کچھ کرنا ہوتا تو وہ کب کا پھاہے لگ چکا ہوتا۔اس نے صاف لفظوں میں بتایا کہ قانون رشوت کا پجاری ہے۔رشوت کے بل پر ہی وہ اپنا کام نکلوا سکتا ہے اور یہ بات بھی سوچ رکھو کہ یہ بات اگر میں تمہیں بتا رہا ہوں تو سودھا سنگھ تم سے پہلے یہ بات جانتا ہے۔وہ پکی ہڈی کا آدمی ہے۔

رشوت ستانی نے معاشرے میں ایسی جڑ پکڑ رکھی ہے کہ لوگ ڈاکہ زنی، چوری، مکاری اور لوٹ مار آرام سے کر لیتے ہیں اور رشوت کے زور پر باعزت بری بھی ہو جاتے ہیں۔کچھ تو پہلے ہی آدھا حصہ اس آدمی کے نام کر چکے ہوتے ہیں جس کے ذریعے وہ کام نکلوانے کا ہنر جانتے ہیں رشوت لینے والا تب ہی رشوت لیتا ہے جب وہ اپنا ایمان اور ضمیر بیچ چکا ہوتا ہے۔پھر وہ چاہ کر بھی خود کو راہ راست پر نہیں لا سکتا کیونکہ رشوت کا نشہ اس کی زبان کو لگ چکا ہوتا ہے اور پھر وہ خود کو غیروں سے عظمت و برتری کا احساس خود میں لیے غفلت کا مظاہرہ کرتا ہے۔رشوت نے ہمارے معاشرتی نظام کو کھوکھلا کر دیا ہے۔جب یہ وبا پھیل جاتی ہے تو اس کی وجہ سے ہر حاکم و محکوم ہیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پورا نظام حکومت لاقانونیت کا شکار ہو جاتا ہے اور اس طرح پوری قوم بے اطمینانی، پریشانیوں اور مختلف قسم کے مصائب کا شکار ہو جاتی ہے۔ناول نگار نے بھی ایسی ہی لاقانونیت کا ذکر کہانی میں کیا ہے۔

> ''یہ انگریز بابو اور میمیں یہاں کتے لڑانے، زمینیں خریدنے، کبوتر اڑانے اور کوٹھیاں بنانے کا دھندا کھلے کھیتوں کرتے ہیں اور یہ سب عیاشیاں رشوت کے بغیر نہیں ہوتیں۔میرے بھائی کے بیٹے یہ رشوت کا خون ان کے منہ کو بھی لگ چکا ہے۔ہاں ایک بات ضرور ہے

جہاں دیسی دلا دس لیتا ہے یہ گورا وہاں بیس لیتا ہے۔قل میں فرق ہے
کرتوت میں نہیں رہا۔ کیا تو نہیں جانتا؟ اگر یہاں انصاف کی رسی
ہوتی تو میں کب کا پھانسی لگ چکا ہوتا'' (24)

ناطق نے رشوت ستانی سے اپنے خیالات کا اظہار بہت ہی عمیق مطالعہ کے بعد کیا ہیکہ کوئی بھی کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کے آپ رشوت کا شہد نہیں اگلے کو کھلا دیتے معاشرے میں جڑ پکڑتی یہ برائی معاشرے میں ناسور بنتی جارہی ہے جس پر ناطق نے کہانی میں صاف لکھا ہے کہ اگر انصاف نام کی کوئی چیز ہوتی تو مجرم کب کا پھانسی لگ چکا ہوتا۔

عوام کا استحصال

ٹیکس کا موجودہ نظام امیر لوگوں کا تحفظ ،مفلس اور متوسط آمدنی والے طبقے پر بوجھ ڈالتا ہے۔ عام عوام کو جو ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے وہ ضرورت اشیا کے مطابق سترہ فیصد ہوتا ہے مگر تمام ٹیکسز کو ملا کر تین گناہ زیادہ بن جاتا ہے۔اور یہ ٹیکس امیر آدمی کے لیے تو رائی برابر مگر غریب اور متوسط طبقہ افراد کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ پاکستان کے تمام رہنما قانون آئین اور جمہوریت کی بات کرتے ہیں مگر ان عظیم رہنماؤں نے کبھی بھی موجودہ نظام میں ٹیکسز کی اصلاح کا ایجنڈا پیش نہیں کیا تو شروع سے یہ نظام چلتا آرہا ہے، یہ جوں کا توں ہی رہا اور عوام کا استحصال کیا جاتا رہا۔قوم مسلسل اقتدار اور اعلی منصب پر فائز لوگوں سے ٹیکس وصول نہ کرنے کی سیاسی سرپرستی کی وجہ سے نقصان برداشت کرتی رہی۔لیکن اذیت کی بات تو اصل میں یہ رہی کہ یہ حکومت پھر بھی خود کو عوام کا خیر خواہ کہتی رہی۔موجودہ استحصالی نظام کی وجہ سے وہ افراد جن کا تعلق غریب طبقہ سے ہے انھیں کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جارہا ہے اور غربا میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ملکی ترقی تب ہی ممکن ہے جب طبقاتی تفریق کا خاتمہ کیا جائے اور مساوات کا نظام روا رکھا جائے۔

ناول نگار نے کہانی میں عوام کے استحصال کو بھی موضوع بنایا ہے۔زمینداروں کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اچھی کاشت کاری کر سکیں جس کے لیے وہ زمین کے عوض سود پر رقم لیتے ہیں اور مقررہ وقت پر جب سود واپس نہیں کیا جاتا تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ زمین بنیوں کے پاس چلی جاتی ہے۔اس سے

ایک نقصان تو یہ ہو رہا ہے کہ مزارعے دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں دوسرا کاشتکاری کا نظام بھی آگے پہنچ نہیں پا رہا اور دوسری طرف ان کے خود کار یعنی نجی بنکاری کی وجہ سے سرکاری بنکوں کا دیوالیہ نکل جاتا ہے اور اس عمل سے ملک کو کافی خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ناطق نے سود کا کاروبار کرنے والوں، سود لینے والوں اور بینکوں کو ان سب کو اپنی نثر میں تفصیلاً بیان کیا ہے کہ سود کا کاروبار کرنے والے اس بات سے واقف ہوتے ہیں کہ سود لینے والا کبھی بھی اتنی رقم اتنے عرصے میں واپس نہیں کر پائے گا اس لئے وہ پہلے سے ہی یہ سوچ کر بیٹھا ہوتا ہے کہ دونوں طرح سے نفع کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

زمیندار مجبوراً اپنی زمین کو بنیے کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے خود تو بنیا کاشتکاری کرنے سے رہا اس لیے وہ واپس سود ادا کرتا ہے کہ زمیندار اپنی ہی زمین پر کاشت کاری کرے اور جس کے بدلے اسے کم معاوضہ دیتا ہے۔ اس طرح وہ نہ صرف زمیندار کا بلکہ بنکوں کا بھی دیوالیہ نکال دیتا ہے۔ ناطق نے اس معاشرتی پس ماندگی کو زمیندار کے لیے ایک ایسا نقصان کہا ہے جس کی وجہ سے وہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے اور دوبارہ کبھی دلجمعی سے اپنا کام نہیں کر پاتا۔ ناطق کہانی میں یوں رقمطراز ہیں :

> ''زمینداروں سے سود کی رقم ادا نہیں ہو پاتی، نتیجہ یہ کہ ان کا کیس عدالت میں آجاتا ہے اور عدالت قرضے کے عوض زمینداروں کے مالیاتی حقوق بنیوں کے نام کر دیتی ہے بنیے خود زمینداری سے واقف نہیں۔ وہ سب کچھ مزارعوں پر چھوڑ دیتے ہیں یہ مزارع وہی ہوتے ہیں جو ان بنیوں کے مقروض ہیں چنانچہ یہی لوگ ان زمینوں کی کاشت کرتے ہیں لیکن انہیں فصل سے بہت کم حصہ ملتا ہے اور ان زمینوں میں مزارعے دلچسپی چھوڑ دیتے ہیں''(25)

تاریخ گواہ ہے کہ اس طبقاتی کشمکش میں کسان ہمیشہ خسارے میں رہا ہے۔ ایک طاقت ور با اثر طبقہ ہمیشہ سے ہی زراعت سے منسلک مزدوروں اور کسانوں کا استحصال کرتا رہا ہے۔ حکمران جانتے ہیں کہ کسان کی بدولت ہی زرعی پیداوار ممکن ہے انھیں کسان کی محنت کا اندازہ بھی ہے مگر اس کے

باوجود بھی انھوں نے جبر اور سختی کا سلوک کسانوں کے ساتھ روا رکھا۔ ان پہ بھاری ٹیکس لگا کر ان کا استحصال کیا، ان کی زندگی نہ صرف اجیرن کر دی بلکہ ان کی پیداوار پر قبضہ کر کے ان کو پستی کی طرف لے گئے۔

کسانوں میں نہ تو اپنی اس زیادتی پر بغاوت کا کبھی کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ خود متحد ہو کر اپنے لیے کسی قسم کی کوئی کوشش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بغاوت کی صورت میں ان کی کامیابی مشکوک ہے۔ اس لئے وہ اپنے ساتھ ہونے والے اس سلوک کو بہت حوصلے سے برداشت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایک سنگین مسئلے کی صورت میں معاملہ سامنے آتا ہے کہ کسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی زمین کو بیچ دیا گیا ہے اور اس پر ظلم یہ کہ کاغذوں میں اس کا اندراج بھی نہیں ہوتا۔ مصنف نے اس بات کی وضاحت کچھ یوں کی ہے۔

ٹیکس ادا کرنا کسان کے بس میں نہیں ہوتا اور کچھ وقت کے بعد زمین خود بخود مالیہ ادا کرنے والے کے نام ہو جاتی ہے۔ مگر اس سے بھی اوپر گورنمنٹ کا ہاتھ ہوتا ہے جو کوشش میں رہتی ہے کہ اس کا زیادہ فائدہ بنیے کو بھی نہ ملے۔ کیونکہ بنیا جیسی بھی چال چل لے وہ کسی بھی صورت ٹیکس ادا کیے بغیر زمین اپنے نام نہیں کروا سکتا ہے اور ہاتھ ہمیشہ گورنمنٹ کا ہی اوپر رہتا ہے۔

> ''ہم اس نظام کو مشکل بنا رہے ہیں اور ہر حالت میں زمین خریدنے والے پر بھاری ٹیکس لگا رہے ہیں۔ وہ کسی بھی صورت میں بغیر گورنمنٹ کو ٹیکس دیے زمین اپنے نام نہیں کروا سکتا۔ دوسری طرف بہت سے فیصلے چونکہ تحصیل سطح پر آپ نے خود ہی کرنے ہیں اس لیے کوشش کرنا کہ بنیوں کو کم سے کم ان فیصلوں میں فائدہ پہنچے'' (26)

ناول نگار نے عوام کو مجبور دکھایا ہے کہ وہ کسی بھی صورت اپنی زمین کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے۔ زمین داروں کے پنجے سے نکل بھی جائیں تو قانون کا شکنجہ بہت سخت آن پکڑتا ہے اور عوام مسلسل غربت و افلاس میں مبتلا زندگی گزارنے پہ مجبور ہو جاتی ہے۔

ملاؤں کا پراپیگنڈہ

ولیم جب سے جلال آباد آیا تھا وہ اس معمے سے باہر نہیں نکل رہا تھا کہ ایسی کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بچوں کی تعداد سکولوں میں بہت کم ہے۔ پہلے پہل تو اس نے سمجھا کہ شاید سرکار کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہے۔ جلال آباد کے تمام سکولوں میں مسلمان طلبا کی تعداد صرف ایک سو پینتیس تھی جن میں صرف اٹھارہ بچے اپر درجے کے تھے۔ ولیم کو بہت سوچنے پر بھی اسے اس بات کا جواب نہ مل پایا تو تسیر داس سے پوچھا، جس پر ایسی حقیقت کا انکشاف ہوا کہ خود ولیم بھی حیران ہو گیا۔ تیچن داس کے مطابق خود مسلمان ہی اپنے بچوں کو سکول بھیجنے سے کتراتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ صرف جلال آباد میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہر جگہ ہی ایسی کیفیت ہے۔ مسلمان حکومت سے خائف رہتا ہے۔ عدم اعتمادی کی وجہ سے وہ کبھی بھی اپنی اس ناراضی کو ختم نہیں کرتا اور انتاکم کی آگ جو دل میں جلائے بیٹھا ہے اس میں اپنے بچوں کو بھی جلا کر راکھ کر دینا چاہتا ہے۔ سکھ مسلم فسادات میں ان حالات کا اکثر سامنا رہا۔ اپنے بچوں کو بچانے کے لیے مسلمانوں نے ہمیشہ اپنا نقصان کیا، یا صرف یہ ایک چال تھی جو کارآمد رہی کہ مسلمان کے کان میں بات ڈال دی جاتی اور پھر اس مسئلے کو اتنی ہوا دی جاتی کہ وہ بھڑک کر شعلہ بن جاتی اور آگ لگ جاتی۔ ایسا صرف فسادات کی وجہ سے تھا ناول نگار نے یہ کیفیت ناول میں کچھ یوں بیان کی ہے:

> ''مسلمانوں کے ملاؤں نے انہیں روک رکھا ہے کہ گورنمنٹ کے سکولوں میں نصاریٰ کی تعلیم دی جاتی ہے اور بچوں کو زبردستی عیسائی بنا دیا جاتا ہے۔ اس لیے مسلمان اپنے بچوں کو گورنمنٹ سکولوں میں بھیجنے سے کتراتے ہیں''(27)

گاؤں کا ماحول سادہ اور لوگ بھی سادہ طبیعت کے مالک ہوتے ہیں وہ ان باتوں کو سنتے ہی کہ ان کے بچوں کو نصاریٰ کی تعلیم دی جائے گی اور عیسائی بنا دیا جائے گا۔ وہ وضاحت کے لیے کسی بھی دوسرے سے بات کرنے کی بجائے خود کو قید کر لیتے تھے، ایک ایسے حصار میں قید جہاں صرف ان کی اپنی ہی دنیا ہے اور وہ یہ سمجھ کر کہ اب ان کی اولاد اس پراپیگنڈہ سے باہر ہے، اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتے ہیں اور اس طرح ان کے معصوم ذہنوں سے کھیلنے والا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آج کے دور میں یہ عام ہو گیا ہے کہ جسے بھی داڑھی رکھے دیکھا گیا تو اسے مولانا صاحب اور ملا سے مخاطب کرنا

شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں کوئی دینی بات بھی بتانے کی کوشش کرے تو ہم اسے کہنے لگتے ہیں کہ تم تو مولوی ہو گئے ہو۔ اگر جائزہ لیا جائے پرانے دور کا تو یہ بات بھی منظر عام پر آتی ہے کہ ان مولویوں نے ہی پاکستان کو طرح طرح کے فتوے جھاڑ کر تباہ کیا تھا۔ کہیں تباہی اور دہشت گردی کی بات بھی چل نکلے تو اس کے پیچھے بھی مولوی ہیں اور یہ بھی کہ یہ لوگ جاسوس ہیں۔ ایسی تمام باتیں کیوں کی جاتی ہیں، کوئی تو وجہ ہوگی، کوئی تو حقیقت ہوگی؟

اسلام میں یہ لفظ ''ملا'' اور ''مولوی'' احترام اور تعظیم کے لیے کہے جاتے ہیں اور آج بھی ان الفاظ کو شرفاء میں تعظیم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اسلام چونکہ دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ جہاں کہیں بات سے اختلاف کرتے ہیں وہاں ہی ان مولوی حضرات کو مختلف القابات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

> ''نیز اگر یہ صحیح ہے کہ معلم کا اثر متعلم پر پڑتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ کتابوں کے جامد نقوش سے جمود پیدا ہوگا اور متحرک و سرگرم انسانوں سے حرکت و سرگرمی اور عمل کی طاقت پیدا ہوگی۔ اسی طرح دین کا فہم صحیح اور حکمت عملی بھی صحبت و رفاقت اور حرکت و عمل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی کہ ایک صحیح حرکت ہزار پردے اٹھا دیتی ہے۔''(28)

مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا دین کسی بیزار طبقے کی نذر ہو گیا ہے۔ وہ علما سے ان کے مذہب کی چادر اتار دینا چاہتا ہے اور اپنی ذات کی تسکین چاہتا ہے۔ ان مولویوں کے لیے ہمیشہ سے مختلف پروپیگنڈے، بے توقیری کے الزامات عام کیے جاتے ہیں تا کہ تمام لوگ ان سے متنفر ہو جائیں۔ اس طرح علما سے دوری دین سے دوری کہلاتی ہے اور اس طرح بیزار طبقہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انگریز سامراج مولویوں کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں جاسوس بھی قرار دیتے ہیں اس کے برعکس ناول نگار نے جو ملاؤں کا کردار بیان کیا ہے اس میں ملا حضرات بچوں کو خود تعلیم سے روک رہے ہیں۔ ان کے شعور کو پستی سے آشنا کر دینا چاہتے ہیں اور انگریز کے خلاف تحریک چلا کر خود اپنے ہی لوگوں کے خلاف سازشیں اور مخبریاں کرتے ہیں۔ انگریز سے مالی مفاد کو سمیٹ

لینا چاہتے ہیں اور دین کی حمایت میں اور قومی غیرت کو غارت کرتے نظر آتے ہیں۔اگر صرف ان چند باتوں کا ہی جائزہ لیا جائے تو با آسانی اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس قسم کا پروپیگنڈا ملا حضرات کرنا چاہتے ہیں۔سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''عربوں کو تہذیب کی تعمیر اور عربی معاشرہ کی تشکیل کا واحد راستہ ایک نئے اشترا کی عرب انسان کی تخلیق ہے۔جس کا عقیدہ یہ ہو کہ اللہ مذاہب جاگیرداری وسرمایہ داری استعماء ؓ وغرض وہ ساری قدریں جو قدیم سوسائٹی پر حکمراں تھیں صرف تاریخ کے میوزیم کی ممی کی ہوئی لاشیں ہیں''(29)

ولیم کو یہ کام مشکل ضرور مگر ناممکن ہرگز نہیں لگا۔وہ کوشش کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔وہ گورنمنٹ کو بھی اس کام میں شامل کر لینا چاہتا تھا اور یقین کے ساتھ کہنے لگا کہ وہ گورنمنٹ سے فنڈ ز بھی منظور کرا لے گا۔ناطق نے ولیم کے کردار کے ذریعے کہانی میں دکھایا ہے کہ ولیم نے جلال آباد کو کس قدر دنوں میں عروج دکھایا۔بہت کم دنوں میں پالیسی کو ترتیب دیا گیا اور جلال آباد کے جتنے گاؤں تھے ان کو دس پہ تقسیم کیا گیا اور ہر گاؤں کا ایک مرکزی گاؤں بنایا گیا۔

جس میں آٹھویں درجے کا سکول اس میں دس گاؤں کے بچے پڑھنے آیا کریں گے اور اسی طرح پانچ گاؤں کے لیے پانچویں درجے کا سکول بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔مطلب ملاؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ان کا کیا رویہ ہے۔ولیم نے اس پالیسی کو کامیاب کرنے کے لیے مختلف منصوبے بنائے۔اس طرح تحصیل میں آٹھویں درجے کے تیس اور پانچویں درجے کے ساٹھ سکول بنائے گئے اس کے بعد دسویں درجے کے لیے بھی رپورٹ بنالی گئی۔اس ساری رپورٹ کو پورا کرنے کے لیے ولیم نے پکا عزم کیا،جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سکھ مسلم تقسیم کے وقت مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے میں کوئی روک نہ تھی۔یہ بس مسلمانوں کا ہی رویہ تھا کہ جو خود ان کے بچوں کی تعلیم کی راہ میں دیوار کی طرح حائل تھا۔حکومت نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف لانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمائے۔ناطق نے کہانی میں گورنمنٹ اور ملاؤں کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

''جب تک مسلمان مولوی راستے میں حائل ہیں، یہ کام مشکل نظر آتا ہے لوگ کسی بھی طرح اپنے بچوں کو سکول بھیجنے پر تیار نہیں ہوتے۔ہم نے لاکھ طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔آپ ہی کچھ اس بارے میں حکم دیں یا پولیس کے ذریعے خبر سے انھیں لایا جائے اور جرمانے یا سزا کا عمل دخل کیا جائے''(30)

جب ولیم نے یہ طریقہ کار ملاؤں کا دیکھا تو ولیم نے سوچا کہ ٹیڑی کھیر کو ترکیب سے ہی درست کیا جاسکتا ہے۔ناطق نے یہاں پہ بہت ہی دانشمندانہ ترکیب کو عمل میں دکھایا ہے کہ مسلمان بچوں کو تعلیم کی طرف لانے کے لیے ان ہی کے اندر سے لوگوں کو تعلیم کے عہدے پر فائز کرنا ہوگا۔مصنف کہانی میں مولوی کرامت علی کے کردار کے ذریعے ایک نیا موڑ لے کر آیا۔کرامت علی کو سرکاری نوکری میں لے کر آیا گیا اور اسے حکم دیا گیا۔

مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کیلئے جتنے بچے وہ لے کر آئے گا اتنا ہی اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا جائے گا۔اس طرح خود ملاؤں کا پراپیگنڈہ بھی ختم ہوجائے گا۔شروع میں کرامت علی کی ڈیوٹی صرف یہی لگائی گئی کہ وہ لوگوں کو تعلیم کیلئے آمادہ کرے گا۔۔پھر ایک دوسری ترکیب ساتھ ہی عمل میں لائی گئی کہ مزید پانچ مولویوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کر کے مولوی کرامت علی کو ان کا ہیڈ بنا دو پھر یہ لوگ خود ہی تعلیم کی طرف اپنے بچوں کو کھینچو کر لائیں گے۔ایسا خیال گورنمنٹ کو پہلے نہیں سوجھا تھا لہٰذا ولیم کا یہ آئیڈیا واقعی کارآمد رہا۔بعض اوقات انسان خود کو گمراہی کی طرف دھکیل لے جاتا ہے۔کہانی کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ناول نگار ولیم کے کردار کے ذریعے جلال آباد کو جنت کا نقشہ بنا دینا چاہتا ہے جہاں امن انصاف ہو سکون ہو بلاشبہ ولیم کا جاندار کردار کہانی میں بہت خوبصورت رنگ بھرتا چلا گیا۔

''مولویوں کو سرکاری سکول کی ملازمت دے کر اور انھیں مسلمان بچوں کے داخلے پر نامزد کر کے حقیقت میں ایک تیر سے دو کام لیے جاسکتے تھے کہ جو روکنے والے تھے،وہ اب دعوت دینے والے

ہوجاتے اور لوہے سے لوہا کاٹنا نہایت ہی آسان ہوجاتا‘‘(31)

اب جہاں پہ ملاؤں کا وسیع پراپیگنڈہ تھا کہ وہ بچوں کو سکول تو نہ بھیجتے تھے۔ وہاں اب وہ اپنی ہی مساجد میں بچوں کو پانچ ٹائم آنے کے لیے کہتے کہ نماز کی طرف آؤ اور جب خاص طور پر جمعہ کا دن گاؤں کا ہر مسلمان نماز کے لیے جاتا تو وہ اپنے خطبات میں یہی درس دیتے کہ گورنمنٹ کے سکولوں میں نصاری کی تعلیم دی جاتی ہے، بچوں کو زبردستی عیسائی بنا دیا جاتا ہے اور ان پڑھ سادہ طبیعت ہونے کی وجہ سے لوگ اپنے مولویوں کی باتوں کو سچ مانتے، پورا پورا عمل کرتے اور حکومت کے بار بار بلانے پر بھی بچوں کو بھیجنے سے انکار کرتے۔

ناطق نے پس ماندگی کا یہ وہ درجہ دکھایا ہے جہاں جہالت نسلوں میں خون کی طرح دوڑتی ہوئی پائی جاتی ہے۔ انسان خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا مستقبل برباد کر لیتا ہے جبکہ اس نقصان سے ان کو وقتی فائدہ تھا کہ وہ دشمن کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تھے یعنی سکھ برادری پر یقین کرنا اور نقصان اپنا بھی کر لینا۔ ایسا پس ماندہ طبقہ اب بھی دور حاضر میں موجود ہے جو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے روک کر کنویں کا مینڈک بنا دیتے ہیں۔ آج کے دور میں جہاں لوگ اتنی ترقی کر رہے ہیں مشینی دور آچکا ہے وہاں بہت ضروری ہے کہ ان پس ماندگیوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف مستقبل کا سوچنا چاہیے۔ جہالت کا ایک اور منظر ناطق نے ناول میں دکھایا ہے کہ عوام کی اس قدر بے اعتباری تھی کہ وہ کسی طرح بھی یقین کی طرف نہ آتے تھے۔

جلال آباد کو کیوں ہر وقت دھول مٹی اور گرد و غبار میں دیکھا جاتا ہے، یہ کیوں نہیں سر سبز و شاداب نظر آتا۔ ایسی صورت حال میں بھی ولیم نے ہندوستانیوں کے لیے سوچنا شروع کر دیا کہ اب ان کو کس طرح جہالت سے باہر نکالے۔ سکھ مسلم تصادم میں زیادہ جو محرومی کی وجوہات تھیں وہ خود انہی کی پیدا کی گئی تھیں دونوں کی آپس میں بے یقینی نے انتشار پھیلا رکھا تھا۔ ناطق نے اسی ناراضی کا اظہار کیا ہے کہ وہ سکھ ہندو تقسیم سے خائف نظر آتے ہیں وہ ان دونوں قوموں کو ہی الزام دیتے ہیں اور ہندوستانیوں کی جہالت کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس پر قاری کو پڑھ کر ہندوؤں کے اس طریقہ کار پہ ہنسی آئے۔ ناطق لکھتے ہیں:

''لوگ نہر سے نکالے گئے کھالوں کے نگال میں مٹی اور کوڑا کرکٹ بھر دیتے ہیں اور نہر کا پانی فصلوں کو لگنے نہیں دیتے۔ان کے خیال میں گورنمنٹ نے نہر کے پانی میں ایسی دوا ملا رکھی ہے جس سے فصلوں میں بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔جب اس کا غلہ لوگ استعمال کرتے ہیں تو وہ بیماری لوگوں میں پھیل جاتی ہے یعنی انسان نامرد ہو جاتا ہے اور نسل آگے نہیں بڑھتی''(32)

ناول نگار نے بتایا ہے کہ ہندوؤں کا خیال تھا کہ گورنمنٹ ان کو نامرد کرنا چاہتی ہے،نسل کشی کی سازش کر رکھی ہے۔اس لیے وہ سرکاری پانی فصلوں کو لگنے ہی نہیں دیتے تھے اور مکمل انحصار بارشوں پر کرتے تھے۔ہندوؤں کے اس نازیبا طور طریقے پر گورنمنٹ ان پر حاوی تھی۔ویسے بھی ناطق کے مطابق انگریز قوم سکھوں کو جاہل سمجھتی تھی اور ان کا یہ ماننا بھی تھا کہ اگر یہ قوم سادہ اور جاہل نہ ہوتی تو کہاں ممکن تھا کہ پندرہ بیس ہزار انگریز ان کروڑوں کی تعداد میں سکھوں پہ حکومت کرتی۔ان کی یہی جہالت تھی جس کی وجہ سے یہ لوگ انگریز سرکار کے دباؤ میں تھے اور انگریز سرکار اس کو نعمت سمجھتی تھی۔یہاں بھی ولیم نے راستہ نکالا کہ جس طرح مسلمانوں کو تعلیم سے قربت کے لیے انہی کے بندوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا۔ادھر بھی ولیم نے حکم جاری کیا کہ وہ پانی جو الاٹ شدہ ہے اس کو ضائع کر دیا تو بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔اس طرح ہندو بھی مجبور ہوئے پانی استعمال کرنے کیلئے،کچھ کو تو یہ خیال بھی تھا کہ سرکار ان سے بھاری معاوضہ لے گی پانی استعمال کرنے کا اس لیے وہ پانی بالکل بھی استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔

کہانی کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف انگریزوں کے خلاف نہیں تھے تو کہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔اصل بات تو یہی ہے جس کا ذکر انھوں نے بھی کیا ہے کہ وہ ہندو سکھ تقسیم سے خائف نظر آتے ہیں۔انہوں نے کہانی میں ایک ہندو زمیندار کا ذکر کیا ہے جس نے صرف ڈر ہی سے کہ گورنمنٹ پانی کا معاوضہ فصل کی قیمت سے بھی زیادہ لے گی تو اس نے فصل کو کاٹ دیا۔

''زمیندار سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ ان سے پانی کا معاوضہ لیگی،جو ان کی فصلوں کی قیمت سے بھی زیادہ ہوگا۔اسی ڈر سے ایک زمیندار نے اپنی

بیسوں ایکڑ کھڑی چاول کی فصل کاٹ کر اپنے مویشیوں کو کھلا دی تا کہ ''نہ ہو بانس نہ بجے بانسری'' ب ایسے میں بتایئے کیا کیا جائے''(33)

انگریزوں کی کالوں پہ حکومت کا برملا اظہار ناول نگار نے وہاں دکھایا ہے جہاں ولیم کو اس کے باپ نے بتایا کے کالے اور گورے کے درمیان ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ اگر اس فاصلے کو تم اپنی محبت سے ختم کرو گے تو اقتدار کی وہ رسی جو ہم نے ان کالوں کے گلوں میں ڈال رکھی ہے اسے کاٹ دیں گے اور ہمارا اقتدار بھی جاتا رہے گا۔

ولیم کے باپ نے بتایا کہ اگر اس نے کالوں کو جہالت سے نکال دیا تو یہ کبھی بھی دب کر نہیں رہیں گے۔ ان کی اس جہالت ہی کی وجہ سے ہم ان پر حکومت کر رہے ہیں چنانچہ اب یہ رعب و دبدبہ ان کالوں پہ قائم رہنا بہت ضروری ہے۔ اس گفتگو سے ناطق کا انگریزوں کیلئے سوچنے کا نظریہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ انگریز حکومت کیلئے آئے تھے۔ ہندو سکھ کو ساتھ میں دیکھ نہیں سکتے تھے دونوں کو جاہل قوم تصور کرتے تھے مگر ایک جگہ پر مولوی کرامت علی کے کردار کے ذریعے گورنمنٹ کی تعریف کرتے بھی نظر آتے ہیں۔

جب مولوی کرامت مسلمانوں کو پکار رہا ہوتا ہے کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو تمہارے علاوہ باقی تمام قوموں کے بچے سکول میں تعلیم حاصل کر کے بابو بنیو جا رہے ہیں۔ تم لوگوں کی خود کی کم عقلی کی وجہ سے زمین بھی بنیوں کے پاس جا رہی ہے۔ ہمارے قرضے بڑھتے جا رہے ہیں مگر کرامت علی نے کہا کہ میں صدقے جاؤں، اس منصف اور عادل گورنمنٹ کے جنہوں نے مسلمانوں کیلئے سکول کھولے اور ہم ہیں کہ پھر بھی ناشکرے یہی حالات رہے تو ایک دن وہ آئے گا کہ وہ سارے پڑھ لکھ جائیں گے اور ان کی جگہ ہماری اولادیں ان کا گند صاف کریں گی۔

لوگ مولوی کی طرف مائل ہو گئے۔ مولوی کرامت نے جب اپنے وار کو کارگر دیکھا تو ایک اور تیر سے نشانہ باندھ دیا کہ ہم ان پڑھ خود خط بھی نہیں پڑھ سکتے جب خط پڑھنا ہو تو اوروں کے پاس جانا پڑتا ہے اس طرح وہ باتیں جو چھپانا ہوتی ہیں وہ باتیں بھی پردے میں نہیں رہتی ہیں۔ بالآخر مولوی کرامت کی باتیں لوگوں کے دلوں کو جیت ہی گئی۔

''ایک شخص جس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ اس نے سر سے

صافہ اتار کر گھٹنوں کے نیچے رکھا اور بولا، ہم تو پتر خط بھی نہیں پڑھ
سکتے۔ کہیں سے شادی موت کا لفافہ آ جائے تو بیس دروازے بھونکتے
ہیں تب جا کر کوئی پڑھ کر سناتا ہے وہ بھی سونخرے کرتا ہے'' (34)

مصنف نے بتایا کہ اپنے ہی لوگوں نے اپنوں کو مفلوج زندگی گزارنے پہ مجبور کر رکھا تھا اور نسل در نسل یہ سلسلہ جاری رہا تا کہ جہالت سرایت کر جائے، عوم سر اٹھانے کے قابل نہ رہے اور خود اعتمادی ختم ہو جائے۔

الیکشن میں دھاندلی

جب سے ملک میں پارلیمانی انتخابات ہو رہے ہیں تب سے ہی پاکستان میں انتخابی دھاندلی بھی ہو رہی ہے۔ اب تک جتنے انتخابات ہو چکے ہیں اس میں سے کوئی بھی ایسا نہیں گزرا جب میں عوام کی رائے کو بدل دینے یا پھر طاقت کے زور پہ اقتدار حاصل کر لینے کا الزام نہ لگایا گیا ہو۔ جب بھی انتخابات شروع ہوتے ہیں تو دھاندلی کے نت نئے طریقے بھی دریافت ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ بات کبھی جعلی ووٹوں اور کبھی نتیجے کو بدل دینے پہ آ کر ختم ہو جاتی، حد سے تجاویز تب کرتی جب قتل و غارت عام ہو جاتی۔ پولنگ کا وقت ختم ہونے کے بعد بھی اپنی مرضی کے ووٹ یا مطلوبہ مقدار کے مطابق ووٹنگ کر لی جاتی ہے۔ اسے ہم پری پولنگ دھاندلی کہتے ہیں۔ یعنی پہلے سے ہی یہ طے کر لینا کسی صوبے کو کتنی نشستیں دی جائیں۔ اس میں اس بات کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی صوبے کو ملنے والی نشستوں کی تعداد اس کی آبادی کے مطابق ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر کہیں آبادی زیادہ ہیا ور اسے کم بتایا جائے تو اس طرح ضلع کی ووٹنگ کی قوت کو بھی کمزور، طاقت ور یا مضبوط دکھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں بھی دھاندلی کی جاتی ہے وہ ہے جیری مینڈرنگ اس کا مطلب ہے کہ حلقہ بندیاں کرنا یعنی ایک فریق جو بہت زیادہ لوگوں کی حمایت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اسے دوسرے فریق کے مقابلے میں نقصان اٹھانا پڑے۔ اس سے دو بڑے مقاصد سامنے آتے ہیں ایک تو جب مخالفین کی حمایت کم ہو جاتی ہے تو ووٹر بھی ایک ہی ضلع تک خود کو محدود کر لیتے ہیں۔

یہ سب سے برا طریقہ کار ہوتا ہے کیونکہ یہ بند دروازوں کے پیچھے ہوتا ہے۔ اگر انصاف

پسندی سے کام لیا جائے تو وہاں موجود تعداد نتائج کو بدل کر رکھ سکتی ہے۔تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے فریق کی کوئی گزشتہ غلطی یا معافی میں کیا گیا۔کچھ کام جو قانونی طور پر قابل قبول نہیں تو اپنے مخالف امیدوار کے کاغذات نامزدگی کو مسترد کروایا جاسکتا ہے۔مگر اس طریقہ میں بات دنوں پہ پڑ جاتی ہے۔یعنی جس کو نااہل قرار دیا جائے وہ عدالت کی طرف بھی رخ کرسکتا ہے کہ اس کے جرم کو ثابت کیا جائے۔

ناول نگار نے بھی کہانی میں الیکشن میں دھاندلی کو موضوع بنایا ہے اور سیاسی پس ماندگی کو عیاں کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔غلام حیدر جب احسانات کے نیچے دب جانے کا بوجھ محسوس کرنے لگا تو اس نے نواب افتخار کو انتخابات میں مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔نواب افتخار جو کے پنجاب مسلم لیگ کے صدر ہیں اور اس علاقے سے الیکشن لڑ رہے تھے۔جہاں غلام حیدر کا ہی بول بالا تھا۔ناطق نے صورت حال کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ:

> ''نواب کا جو میرے اوپر احسان چڑھ گیا ہے وہ تو شاید عمر بھر نہ اترے لیکن کم از کم اس علاقے میں تو اس کے خلاف کوئی بندہ پرچی نہ ڈال سکے۔اس کے لیے ہمیں چاہے کسی بھی قسم کی زبردستی کرنی پڑے مسلم لیگ کو ہر حالت میں پورے علاقے سے الیکشن جتوانا ہے۔کانگریس اور یونینسٹ کے امیدواروں کو پرچیاں دینا تو ایک طرف جلسہ تک نہیں کرنے دینا اس کیلیے جتنا اسلحہ چاہیے وہ میں بندوبست کرنے کو تیار ہوں''(35)

ناول نگار نے کہانی میں بتایا ہے کہ غلام حیدر اس کام کو دل وجاں سے کرنے کے لیے تیار تھا اور اس میں اپنے ساتھ ملک بہزاد کو بھی ملا لیا۔رہی سہی کسر ساری ملک بہزاد نے نکال دی کہ مسلم لیگ کو ہر حال میں ہی جیتنا ہوگا اس کا ساتھ ہم نہ دیں گے تو اور کون دے گا۔اس نے کہا کہ یہ کام سودھا سنگھ کو دنیا سے رخصت کرنے سے زیادہ مشکل تو نہیں اس نے غلام حیدر کی بات کو مزید ہوا دی کہ پہلے جس طرح تم نے سودھا سنگھ کا خاتمہ کیا ہے۔تمہارا نام تو پہلے ہی مشہور ہو چکا ہے۔اس نے غلام حیدر سے کہا

کہ الیکشن کے دن اگر نواب افتخار کو کوئی خطرہ لاحق ہوا یعنی ووٹ اس کی حمایت میں گئے تو وہ اپنے بندوں کو ہمارے ساتھ لگا دے ہم انتخابات کے دن ہی پانسہ پلٹ دیں گے۔ کسی کی جرات نہ ہوگی کہ وہ مخالف فریق کو ووٹ ڈالے۔

بس اس سے پہلے یہ کام کرو کہ اپنی بہادری کے قصے کو مشہور کرو نواب افتخار کے قصوں کو مشہور کرو تا کہ لوگ اس کی طرف مائل ہوں اگر پھر بھی کوئی کسر رہ گئی تو ہم اس علاقے کا دورہ کریں گے اور تمام معلومات لے لیں گے اور حالات کا پانسہ پلٹ دیں گے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ایک جیتا ہوا انسان کس طرح ہار جاتا ہے، سازشوں کا شکار ہو جاتا ہے اور حق سے محروم ہو جاتا ہے۔

> ''پھر بھی جس جگہ سے نواب کے خلاف ووٹ پڑنے کا خطرہ ہوا، وہاں نواب سے کہہ دینا، الیکشن والے دن اپنے بندے ہمارے ساتھ کر دے، نگرانی ہم کریں گیاور پرچیاں اپنے ہاتھوں سے نواب صاحب کی صندوقچی میں ڈالتے جائیں گے جس نے چوں چراں کی، چار متھریں چوتڑوں پر ماریں گے اور سیدھا کر دیں گے۔''(36)

انتخابات میں دھاندلی کے لیے اگر ایک فریق انتخابات سے پہلے بھرپور کوشش کر چکا ہو تو دوسرا موقع اسے انتخابات کے دن میسر آتا ہے اور اس کا سب سے کارگر طریقہ یہ کہلاتا ہے کہ جن اضلاع میں اس کا بس چلتا ہو وہاں کے پولنگ اسٹیشن پر قبضہ کر لیتا ہیاور وہاں نگران کو مختلف طریقے سے چپ کروا دینا یہ عام ترین طریقہ ہے۔ کیونکہ اکثر پولنگ اسٹیشن پر ایسے ہی قبضہ کر لیا جاتا ہے اور اپنی من مانی کی جاتی ہے۔ خواتین کے بوتھ پر اکثر مرد حضرات برقعہ پہن کر بھی دھاندلی کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ اور وہاں جہاں ابھی تک امیدوار ووٹ کے اندراج کے لیے نہیں پہنچا ہوتا، مرد حضرات ووٹ ڈالنے کے لیے اپنا اثر دکھا گئے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار تو جب یہ طریقہ بھی کام نہ کرے، مطلب ایسا تو ممکن نہیں کہ کام نہ کرے، مگر پھر بھی جب مخالف فریق کے جیتنے کے آثار نظر آئیں تو گنتی کر کے بھی اپنے آدمی کو جتایا جا سکتا ہے۔

ناطق نے بھی کچھ ایسی ہی دھاندلی کا نقشہ کھینچا ہے کہ غلام حیدر نے کیسے اپنی دھاک بٹھائی

اور جب جلسے اور جلوس زوروں پر تھے۔ ان جلسوں میں فریق کے بھی چند ایک جلسے جلوس نظر آجاتے جو بالکل آٹے میں نمک برابر تھے۔

غلام حیدر کے لوگ اس طرح سارے علاقے میں پھیل چکے تھے کہ ان کو جگہ نہ ملتی تھی۔ بہت جگہوں پر ہاتھا پائی ہوئی اور بات ختم ہوگئی۔ فریق بدک گیا اور ان کے سامنے آنے سے گریز کرنے لگا اور ہوا کچھ یوں:

''اس دوران ڈیوٹی پر موجود تین چار پولیس والوں نے دخل اندازی کی تو ان کے چوتڑوں پر بھی دو دو ڈنڈے لگوا دیے گئے۔ انہی واقعات کا نتیجہ تھا کہ وہاں مخالفین سہم گئے۔ ووٹ مانگنا تو ایک طرف انہوں نے غلام حیدر کے اثر ورسوخ والے علاقوں میں آنا ہی چھوڑ دیا۔'' (37)

ایک اور بات دھاندلی میں زور پکڑتی جارہی ہے وہ ہے ووٹروں کو رشوت دینا، اس طرح ان کے آدھے ادھورے وعدے کر لیے جاتے ہیں اور ڈھکی چھپی بات میں دھمکیاں دے کر کام کروایا جاتا ہے۔ بااثر افراد اکثر دھاندلی کرنے والوں کا ساتھ دینے والوں کو رشوت کے بوجھ تلے دبا لیتے ہیں اور اس طرح انہیں ہدایات دی جاتی ہیں کہ ان کے ماتحت لوگ وہیں ووٹ ڈالیں جن کے لیے ان کو ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ بااثر افراد کو رشوت دینا ہمیشہ ایک اکیلے فرد کو رشوت دینے سے بہت بہتر ہے کیونکہ اس طرح آپ رشوت دے کر یہ یقین دہانی نہیں کرا سکتے کہ وہ ووٹ آپ کے من چاہے کو ہی دے گا۔

خفیہ طاقتوں کی جانب سے بھی کسی مخصوص پارٹی کے لیے حمایت کرنا اور پھر اسے میڈیا کے ذریعے پھیلا دینا، پاکستان میں یہ بھی ووٹروں کے تاثر میں اثر انداز ہوتی ہے۔ جدید دور میں میڈیا پر بھی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ مخالف پارٹیوں کو زیادہ ٹائم کوریج نہ دیں، یہاں تک کہ ٹی وی پر بھی نشریات کو روک دیا جاتا ہے تاکہ ائیر ٹائم نہ ملے اور منصفانہ کوریج نہ ملے۔ اس صورت میں وہ عوام سامنے آتی ہے جو سوئنگ ووٹ دیتے ہیں یعنی اس کا ذہن پختہ نہیں ہوتا اور وہ پس ماندہ ذہن یا غیر پختہ ذہن سوئنگ ووٹ کا پانسہ بدل کر رکھ دیتے ہیں۔

عوام کی دیکھا دیکھی کہ کوئی کیا کر رہا ہے۔ کس کو زیادہ ترجیح کس بات پر دی جاتی ہے کو مدنظر

رکھتے ہوئے مخصوص سیاسی جماعت کو جسے وہ خود بھی ٹھیک سے جانتے نہیں ووٹ ڈال رہے ہوتے ہیں۔ایسے ہی لوگوں کا ذکر ناطق نے اپنی کہانی میں کیا ہے کہ کس طرح لوگ ووٹوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ووٹروں کو مخالف سیاسی پارٹی سے دور رکھنے اور پھر اپنی سیاسی پارٹی کو دینے کے لیے قائل کرنا بھی ''سوئنگ ووٹ'' جیسا ہی ہے۔ناطق لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک ریکارٹ لو،جس میں تمہارے سارے واقعے قصے کی شکل میں بھرے ہوں۔اس کام کے لیے امیر سبحانی بہت مناسب ہے۔وہ ریکارٹ الیکشن سے پہلے پورے علاقے میں پہنچا دو اور اپنے خرچے پر سنوا دو۔جب تیری بہادری، خدا ترسی ،اور بڑے گھروں کی پہنچ کے قصیلوگ سنیں گے تو وہ خودبخود ہماری طرف دوڑے چلے آئیں گے''(38)

مصنف نے کہانی کے ذریعے اس معاشرتی پس ماندگی کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے جو کہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔یعنی حکمرانوں کو مسلط کیا جانا، زور زبردستی کے ساتھ معصوم اور مظلوم عوام کو دبا دینا،حق دار کو حق نہ ملنا،تعقارت کے بل پر اپنے کام نکلوالینا، اجارہ داری اور رشوت ستانی، یہ سب باتیں کسی بھی معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتی ہیں اور الیکشن کی جس صورتحال کا نقشہ اس نے کہانی میں کھینچا ہے وہ عوام کے ساتھ کی گئی بدسلوکی کا اور زور زبردستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔بے شک اس صورتحال کا نقشہ اس نے بڑی بہادری سے کھینچا ہے۔البتہ غلام حیدر کے کردار کے ذریعے اس کام کا ہونا تھوڑا مشکوک گزرتا ہے۔لیکن یہ ایک دوسری صورت میں معاشرتی پس ماندگی ہے کہ طاقت کا غلط استعمال اگر سودھا سنگھ اور صرف بہزاد کی توسط سے ہوتا تو اچھے کردار کا مثبت پہلو قائم رہتا مگر یہاں غلام حیدر کی اس بے جا زبردستی سے کہیں قاری کے دل میں سوال رہ جاتا ہے۔۔۔بہر حال پس ماندگی کے آئینے سے اگر دیکھا جائے تو ناطق نے بہت چہروں کو کرداروں کے ذریعے بے نقاب کیا ہے۔

مسلم سکھ تصادم اور قتل و غارت

انگریز راج سے پہلے پنجاب سکھوں کی سلطنت کے تحت تھا۔مسلمان ایک قیدی جیسی زندگی

گزار رہے تھے نہ وہ اذان دے سکتے تھے، گائے ذبح کیے جانے تک پر موت کی سزا کا حکم جاری ہوتا تھا۔ جنگ کے دوران سکھ خود کو بچانے کیلیے مسلمان خواتین کو گھروں سے نکال لاتے اور ٹینکوں کے اردگرد باندھ دیتے تا کہ مسلمان حملہ نہ کر پائے۔ یہ تھی جنگ کے دوران بربریت کی حالت سکھ قوم جب بھی تشدد کرتی تو زیادہ تر مسلمانوں کو ہی اپنے تشدد کا نشانہ بناتی لوٹ مار کرتے ہوئے بے تکلفی سے کام لیتی۔ مسلمانوں کے بڑے مقبروں سے بھی سکھ قوم نے پتھر اکھیڑ دیے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مسلمان قوم اس حکومت کے ختم ہونے پر شکر ہی کر سکتی تھی۔ ہمارے ملک نے الگ پہچان پانے کیلئے نہ جانے کتنی سختیاں برداشت کی ہیں، آج کا انسان اس بات کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔

تقسیم ہند کے کچھ واقعات ایسے ہیں کہ جن کو سن کر پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے، روح کانپ جاتی ہے۔ یہ ہم ہیں جو سنتے ہیں، صرف محسوس کرتے ہیں تو روح کانپ جاتی ہے تو وہ لوگ جنہوں نے اس کو جھیلا ہے، ان کو سوچ کر آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ تقسیم پاک و ہند میں اپنی جانیں، عزتیں، مال و دولت سب کچھ قربان کر دیا صرف اپنے اس پاک وطن کی خاطر۔ وہ دن جب اس خوشی کا اعلان کیا گیا تو ہر طرف ہنگامہ ہو گیا۔ خوشی تھی کہ قیام پاکستان کا اعلان کیا گیا وہ مبارک 27 رمضان المبارک کی کڑی صبح اپنے ساتھ ساتھ غم کا پیغام بھی لائی کہ ہمارے مسلم بے یارو مددگار کہیں مردہ تو کہیں زندہ پڑے نظر آئے۔ یہ ایک کڑا امتحان تھا ہمارے لیے کہ اب کون سہارا بنے گا مگر اللہ پر توکل کیبر خت سرو باندھا۔ روزے کی حالت میں ہمارے بزرگوں نیہجرت کی کیا مشکلات جھیلیں یہ تو صرف وہ ہی جانتے ہیں۔

> ''پاک و ہند کی معلوم و متعارف تاریخ میں بلحاظ نتائج اس سے بڑھ کر منحوس و نامبارک واقعہ پیش نہ آیا اس کے اثرات آزادی مل جانے کے بعد بھی بڑی حد تک باقی ہیں اور ان سے نجات کی بظاہر کوئی صورت سمجھ نہیں آتی۔ قومیں عموماً استقلال کے جشن مناتی ہیں تاہم ان کے افراد میں حریت کا جوش اور آزادی کی قیمت تازہ رہے وہ اس خداداد نعمت کی قدر پہچانیں اور اس کی حفاظت کے لیے بے دریغ

جانیں قربان کر دینے پر آمادہ رہیں''(39)

ناطق نے بھی ایسی ہی صورت حال کہانی میں بتائی ہے کہ جب ایک نیا ملک بنانے کی بات ہوئی بلکہ نعرہ لگایا گیا تب ابھی ملک کا تو کچھ فیصلہ نہ ہوا مگر فسادات نے سر اٹھالیا۔ کتنے مہینے تو اسی حالت میں گزر گئے کہ کیا صرف باتیں ہیں یا واقعی ایسا کچھ ہے خاموشی نے آخر دم توڑا۔ سان پر برچھیاں چڑھائی گئیں اور انہیں ڈانگوں پر باندھا جانے لگا الگ الگ گروہ بننے لگے۔

جب گرم خون میں جوش آنے لگا اور طرح طرح کی باتیں پھلنیڑ لگیں کہ فلاں مسلے نے فلاں ہندو اور فلاں ہندو نے فلاں مسلے کو چاقو کے پے در پے وار کر کے قتل کر دیا ہے مگر یہ بھی صرف خوف و ہراس پیدا کرنے کے طریقے تھے یہ ابھی بھی کسی کو پتہ نہیں تھا کہ یہ سب کہاں ہوں گے۔ مگر اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ماحول ایسا بنایا جا رہا ہے کہ جہاں صرف ایک چنگاری سے سب کچھ جل کر راکھ ہو جانا تھا۔ وہ جو آپس میں کام کر رہے تھے سکھ مسلمان وہ بھی الگ الگ ہو گئے۔ سکھ سکھوں کے اور مسلمان مسلمانوں کے ہاں کام کرنے لگے بس خوف کی ایک لہر پھیل گئی کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے پل کیا ہونے والا ہے۔ ایک نعرہ سا بلند ہوتا، لوگ اپنی ڈانگیں برچھیاں اٹھاتے ہوئے حاضر ہو جاتے اور آنے پہ پتا چلتا ہے کہ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی خوف سے بچنے کیلئے لوگوں نے اپنا اسلحہ اپنے سرہانے کے ساتھ رکھ کر سونا شروع کر دیا۔ ناطق نے ایک دل دہلا دینے والا منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہاں کچھ ہی دنوں بعد اتنی سمجھ اور آنے لگی تھی کہ یہ خموش نخوست اس وقت شروع ہوئی جب کسی نے اس ملک میں ایک مزید ملک بنانے کا نعرہ لگایا تھا۔ یہ ملک کہاں تھا؟ کہاں بننا تھا؟ اور اس میں کن لوگوں کو رہنا تھا؟ یہ ابھی طے نہیں ہوا تھا، مگر یہ طے تھا کہ اس کی بنیادوں میں گاڑھے اور پتلے سبھی قسم کے خون کا گارا اور کٹیہوئے سروں کی اینٹیں استعمال ہونا تھیں۔''(40)

مصنف مذکور نے کچھ اس طرح سکھ مسلم تصادم کا نقشہ کھینچا ہے کہ ان دونوں کی آپس کی

لڑائیوں میں کوئی تیسرا فائدہ اٹھانے میں ہمیشہ کامیاب رہا ہے جیسے کہ ہماری تاریخی کہانیوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔اس نے بہت قریب سے ان دونوں کے تصادم کی وجوہات بھی بتائی ہیں اور ان دونوں کے تصادم سے کس کو بھاری معاوضہ یا فائدہ ملنے والا تھا وہ بھی بتایا ہے۔

مہاجرین کے ساتھ ناروا سلوک (تقسیم ہند)

ناطق نے تاریخ کو موضوع بناتے ہوئے ناول میں اپنی تخلیقی کاوش کے فن کو ابھارا ہے اور دل دہلا دینے والے واقعات کا ذکر بھی کیا ہے۔تقسیم ہند: وہ خود بھی اس تقسیم سے خائف نظر آتے ہیں۔اسی لییچفگی کا رنگ ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔اس تقسیم کے ساتھ جو ہنگامہ آرائی ہوئی،قتل غارت عروج پر رہی مہاجرین پر حملے ہوئے اور کروڑوں لوگ موت کی نیند سو گئے۔موت کی نیند سو جانے والے اپنے پیاروں کے دل میں آزادی کے ساتھ ساتھ ناسور کی طرح پلتی ہوئی ایک آگ کی طرح ہیں۔

وہ جو اس راہ میں شہید ہوئے،دل میں آخری خواہش لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے کہ اب وہ ایک آزاد فضا میں سانس لیں گے۔جہاں نہ روز روز ہندو،مسلم،سکھ تصادم ہوں گے،جہاں نہ گولیوں کی بوچھاڑ ہوگی اور نہ ہی ایسا کوئی خطرہ ہوگا کہ کوئی پیارا گھر واپس لوٹ کر نہیں آئے گا۔جانیں محفوظ ہوں گی،عزتیں قائم رہیں گی مگر افسوس صد افسوس وہ ہجرت ان کے لیے آخری سانس کی طرح ثابت ہوئی۔

آزادی کی راہ میں اپنا سب کچھ نچھاوڑ کر دینے والے اس پاک وطن اس پاک زمین کے لیے اپنے پیاروں کیلیے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ان تمام مصیبتوں،اذیتوں اور تکلیفوں کو بیان کرنا نہایت تکلیف دہ عمل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے کیوں کہ وہ اس تکلیف کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو انھوں نے برداشت کی۔بغیر کسی سہارے کہ بے یارو مددگار ہر وقت جان جانے،عزت لوٹ جانے کے خطرے کے ساتھ،آہستہ آہستہ ہجرت کرتے وہ لوگ نہ جانے کتنی راتوں سے سوئے نہیں تھے۔ان پیاروں کو کفن نصیب نہ ہوا۔آہ! یہ بہت دل دہلا دینے والا واقعہ ہے۔خون سیاہی سے مسلمانوں نے اپنی آئندہ نسل کیلیے الگ وطن کی تاریخ لکھی تھی۔

ناطق نے بھی تقسیم ہند کے واقعات کو کہانی میں تفصیلاً بتایا ہے شروع میں حالات اس قدر

سازگار تھے کہ آپس کے جھگڑوں سے بچنے کے لیے دونوں ایک دوسرے سے چھپتے پھرتے تھے۔گلیوں میں کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دیو آ گیا ہو جس نے آن کی آن میں تمام مخلوق کو غائب کر دیا ہو۔ ہندو، سکھ یہ سب مل کر مسلمانوں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔گاؤں چھوٹا ہونے کی وجہ سے کہیں نہ کہیں سے لوگوں کا پتا چل جاتا تھا کہ کون کہاں چھپا ہوا ہوگا۔

''مسلوں نے غلام حیدر کے بڑے احاطے میں پناہ لے رکھی ہے۔ گاؤں چھوٹا ہونے کی وجہ سے انہیں ڈھونڈنے میں زیادہ تگ ودو نہ کرنا پڑی اس نے سوچا، یہ اور بھی اچھا ہے، سارے ایک ہی جگہ پر قابو آ گئے ہیں۔اسی وقت اس نے مکان پر حملے کا حکم دیدیا۔اس سے پہلے کہ شمشیر سنگھ کا جتھا حملہ آور ہوتا، رحمت علی نے فیصلہ کیا کہ سکھوں پر گولی چلادی''(41)

سکھوں کے اس قدر حملوں کی وجہ سے مسلمانوں کو گاؤں سے نکلنے کا موقع میسر نہیں آ رہا تھا۔خوب گولہ بارود کی بوچھاڑ دونوں طرف جاری رہتی اور لاشوں کے ڈھیر لگتے جاتے۔ناطق نے وہ صورت حال بھی دکھائی ہے جس میں حملے کے لیے مرد عورت اور بچے تک بھی ہتھیار ہاتھوں میں لیے تیار رہتے تھے۔حیدر کا خیال تھا کہ کسی بھی صورت میں سکھ عورتوں کی طرف نہ بڑھیں۔دروازوں کی طرف ان کا رخ نہ ہو اس لیے غلام حیدر نے ہوائی فائرنگ رکنے نہ دی اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ سکھ دروازوں کی طرف آنے سے رک گئے۔ایسی دہشت زدہ زندگی مصنف نے کہانی میں بیان کی ہے کہ آزادی کے لیے کتنی جانیں قربان کرنا پڑیں۔ناطق نے جنونی کیفیت بتائی ہے کہ جیسے سکھوں کا مقصد صرف آزاد وطن حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ وہ صرف مسلمانوں کا خاتمہ چاہتے ہوں، مسلمان ہر طرح سے اپنے آپ کو ان کی اس جنونی کیفیت سے بچانے کا طریقہ کر رہے تھے۔

حالات کو اس قدر سنگین دکھا کر مصنف نے ہمارے اندر آزادی کے لیے لڑنے والے شہیدوں کی قربانیوں کی داستان سنانے کی کاوش کی ہے کہ کیسے ان پہ زندگی کو تنگ کر دیا گیا تھا۔مسلمان بھی برابر لڑتے رہے جب تک ہمت اور جان نے ساتھ دیا۔اس کے مطابق سکھوں کی تعداد بھی زیادہ

تھی۔ان کی جنونی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان کے پاس اسلحہ کی مقدار بھی زیادہ تھی۔

''چھویاں، ڈانگیں، کرپانیں اور برچھیاں اس طرح برسنے لگیں جیسے ساون کی بارش برس رہی تھی اور پانی کے ساتھ ساتھ خون کے پرنالے بھی بہنا شروع ہو گئے۔سکھ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لیے نقصان مسلمانوں کا زیادہ ہو رہا تھا'' (42)

ہر طرف ہی خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اس طرح جیسے خون نہ ہو پانی ہو کسی کو کسی کا کوئی احساس نہیں ایک دوسرے کے دل میں نفرت ہی نفرت ہو سارا گاؤں اجڑ کر رہ گیا۔کہیں سے آواز یا علی کی بلند ہوتی تو کہیں سے سکھوں کے نعرے بلند ہوتے۔تقسیم کے فسادات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے سچ میں دل دہل جاتا ہے کہ اس سب کو قاری پڑھ کر گھٹن محسوس کرتا ہے کہ جیسے سانس ٹھیک سے نہیں آ رہا مگر یہ وہ واقعات ہیں جو ہمارے عظیم شہدا پر گزر چکے ہیں۔ناول میں مصنف نے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کا خلاصہ کیا ہے کہ سکھوں نے ان پہ چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا اگر وہ کسی راستے سے بھی بچ کر نکلنے کا سوچتے تو یہ سکھ ان راستوں پہ بھی لاشوں کے ڈھیر لگانے آ جاتے تھے۔قافلوں کی صورت میں لوگ ہجرت کرنے لگے ان قافلوں کو بھی لوٹ لیا جاتا۔رات کے اندھیرے میں روتے سسکتے لوگ اپنے گھروں کو آخری بار دیکھ کر ہجرت کر جاتے، اپنے گھروں کو چھوڑتے ہوئے حسرت بھری نگاہوں کے ساتھ چھکڑوں پر سوار ہو جاتے اور پل بھر کو بھی آرام کرنے کیلیے کہیں نہ رکتے کہ کوئی حملہ آور نہ آ جائے۔کسی طرح بھی ہجرت کرنے والے چاہتے تھے کہ وہ زندگی کو محفوظ رکھ پائیں اور اسی رات کے اندھیرے میں وہ آزادی کی صبح دیکھنے کے لیے منزل پر پہنچ پائیں۔اسی طرح کی صورتحال کو بھی ناطق نے ناول میں بیان کیا ہے کہ لاشیں جواب سوائے بوجھ کے کچھ نہ تھیں۔اپنے پیاروں کو چھوڑ کر اب آگے نکلنا تھا۔وہ چاہ کر بھی لاشوں کو اٹھا نہیں سکتے تھے اور ساتھ میں چھکڑوں پر جتنا وزن کم ہوا اتنا بہتر تھا۔عورتیں بیچاری قابو میں نہیں آ رہی تھیں ان کے لیے تو ان کا سب کچھ یہی مرد تھے جو اب لاشوں کی صورت میں ان کے آگے بے جان پڑے ہوئے تھے۔

''وہ کبھی اپنے کپڑے سنبھالتی اور کبھی بھائیوں، باپوں اور خاندانوں

کے اوپر گر گر کے دوہتھڑ پیٹتیں اور بین کرتیں جنھیں چند لمحوں بعد وہ خود چھوڑ جانے والی تھیں۔ انہیں رہ رہکر ان لاشوں کی تنہائی اور بے کسی کچوکے لگا رہی تھی جن پر اب نہ وہ اگربتی سلگا سکتی تھیں اور نہ ان کی قبروں پر بیٹھ کر ماتم کر سکتی تھیں'' (43)

مصنف نے قافلے کی جو صورتحال بتائی ہے وہ ایک دہشت زدہ ماحول کا نقشہ کھینچتی ہے بد نصیب قافلہ کس طرح اپنے پیاروں کو ایک ہی گڑھے میں دفن کر کے آگے بڑھا اور آگے زندگی پھر ایک نئی آزمائش کے لیے کھڑی تھی۔

نرمی بنگلہ کی پٹڑی پر چار میل تک لاش کے ساتھ لاش جوڑ کر رکھی تھی اور اس طرح رکھی گئی تھی کہ ایک لاش مرد کی اور ایک عورت کی، پھر مرد اور پھر عورت جیسے لاشوں سے خود اس رستے کو سجایا گیا ہو۔ لاشیں بھی اس طرح سے تھیں کہ کسی کا سر نہیں، کسی کا بازو نہیں اور کسی کی ٹانگ نہیں تھی۔ بارش کی وجہ سے بھی ان لاشوں میں تعفن پیدا نہیں ہوا تھا۔ ایک دن پہلے ہی کی لاشیں معلوم ہوتی تھیں جن کو دیکھ کر ایک بار پھر صبر کے بندٹوٹ گئے اور دل منہ کو آتا تھا۔ لیکن ان مشکل حالات میں بھی سفر جاری رکھا گیا۔ اس سفر کے دوران پھر سے لڑائی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس بار مسلمانوں کا سب سے مضبوط قلعہ گر گیا یعنی غلام حیدر کو گولی لگ گئی اور وہ بھی مر گیا۔ منزل کے قریب پہنچ کر وہ دنیا سے کوچ کر گیا۔

''الغرض مسلمان پل پار کرتے رہے اور مجاہد بنتے رہے، جبکہ جلال آباد، شاہ پور اور جودھا پور والے سب کو یہیں چھوڑ کر اپنی لاشوں کے ساتھ منڈی ہیرا سنگھ کی طرف بڑھ گئے'' (44)

مجاہدین کے ساتھ ناروا سلوک پر بھی اگر تاریخ کے اوراق کھولے جائیں تو ایسا بے دردانہ سلوک روا رکھا گیا کہ جس میں یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ ہندوستان میں جو اپنی جائیدادیں چھوڑ جائے گا اسے پاکستان میں حصہ مل جائے گا، مگر پاکستان آنے پر انہیں بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ جو جمع پونجی تھی وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی اور جو امیدیں تھیں وہ بھی ختم ہو گئیں کہ نئی زمین پر بھی کوئی آسرا ہو گا۔ سب سے برا سلوک تو یہ تھا کہ رہنے کو چھت تو دور کی بات کھانے کو پاس روٹی تک نہ تھی۔ خالی ہاتھ،

کھلا آسمان، بھوک سے بلکتے ہوئے بچے اور دوران بارش مسلسل کٹنے والے دن، حادثات کی وجہ سے بیمار جسم، زخموں کو بروقت طبی امداد نہ ملنے پر ناسور بنتے ہوئے زخم، زخموں سے جسم میں پھیلنے والا زہر، ان تمام حالاتوں کے ساتھ اب ان کو ایسے ہی گزارا کرنا پڑا۔ ناطق نے اس تاریخی واقعے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسی ہی داستان کو اپنی کہانی کا حصہ بنایا اور بالکل ویسا ہی کرب دکھایا ہے جس کو پڑھنے کے بعد انسان کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ وہ اس تکلیف سے کیسے گزرے:

> ''ان گاؤں اور قصبہ قصبہ چلنے والے لاکھوں زندگی اور موت کے درمیان، انسانوں اور جانوروں کے درمیان کی مخلوق کو بس کھانے کو روٹی کی ضرورت تھی جو ان کی عزت کے بدلے میں، جان کے بدلے میں یا کسی بھی چیز کے بدلے میں مل جاتی تو یہ جی سکتے تھے لیکن کیا کیا جائے کہ ان لاکھوں خاندانوں میں بارش، بھوک اور مسلسل سفر کے دوران ہیضے اور گردن توڑ بخار کی بیماریاں پھوٹ پڑیں'' (45)

ناطق نے کہانی میں بیان کیا ہے کہ اسٹیشن کے نزدیک جنہوں نے خیمے لگائے ان میں بھی مقامی لوگوں نے آ کر ان سے بچا ہوا مال اسباب لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ قتل و غارت کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ سکھ، مسلم فساد کا سلسلہ آج بھی ختم نہیں ہوا ہے، یہ ایسے ہی چلتا آیا ہے اور اس نے بگاڑ ہی پیدا کیا ہے۔ ایسا ہی مصنف نے کہانی میں بھی لکھا ہے کہ جب تھک ہار کر سب لوگ بیٹھ چکے تھے تو تب قافلے میں محمد زمان نامی آدمی کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک بار پھر دشمنی کو ہوا دے دی۔ اس نے غم کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ گرم خون جو کہ اب لگتا تھا کہ ٹھنڈا ہو چکا ہے، ایک بار پھر جوش میں آ گیا اور آن کی آن میں جل کر سب راکھ ہو گیا۔ اس طرح کے واقعات تاریخ میں بھی ہوتے رہے۔ جب دیکھا کہ حالات ٹھیک ہونے کو ہیں تو پھر ایک چنگاری کو بھڑکا دیا جاتا، جس سے آگ لگ جاتی اور سب پھر سے تباہ و برباد ہو جاتا۔ محمد زمان نے کچھ ایسے رودھو کے اپنا قصہ بیان کیا کہ سب میں بدلے کی آگ پھر سے بھڑک اٹھی اور انہوں نے اسٹیشن پر موجود گاڑی کے تمام دروازے بند کر دیے، چھتوں پر موجود افراد اور آس پاس کھڑے سب کو تلواروں کی نذر کر دیا اور بعد میں گاڑی کے ڈبوں کا

ایک ایک دروازہ کھولتے جاتے اور لاشوں کے ڈھیر لگاتے جاتے۔ وہ یہ سب کس لیے کر رہے تھے، نہیں جانتے تھے۔ بس یہ تھا کہ ایک بار پھر قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور سب ختم ہو گیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے درندگی کا احساس ہوتا ہے۔ انسانیت جیسے ختم ہو گئی، خون سفید ہو گئے اور ایسے کاٹ کاٹ کر پھینکا گویا خود پر ہونے والے تمام ظلموں کا بدلہ لے رہے ہوں۔

''ابھی قتل و غارت رکی ہی تھی کہ جانے کہاں سے میونسپل کمیٹی کے ٹرک آ گئے۔ انہوں نے چند ساعتوں میں وہ لاشیں اٹھا کر پتا نہیں کہاں جا پھینکیں، البتہ اسٹیشن سے اٹھا کر لے گئے۔ اس کے بعد خدا کی قدرت، پھر وہی بارش شروع ہو گئی جس نے اسٹیشن کو دھو کر ایسے صاف کر دیا جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ گویا قدرت بھی ان سب کے ساتھ ساتھ اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔''(46)

بے شک نولکھی کوٹھی ایک تاریخی ناول ہے اور یہ ہمیں ماضی میں لے جاتا ہے۔ وہ دل خراش ماضی کی یادیں، صدمے جو کبھی بھی ہم بھلا نہیں سکتے۔ دل میں یہ اب ایک بھاری پتھر کی طرح ہیں۔ ناطق نے جن پس ماندگیوں کا ذکر کیا ہے ان کو کھلے دل سے جس طرح وہ ناول میں لے کر آئے ہیں، اسے بیان کرنے میں کامیاب رہیہیں۔

ناطق تاریخ کا آدمی ہے وہ قاری کو اپنے ساتھ ماضی میں لے جاتا ہے اور اپنی تنہائی کو قاری کے ساتھ بانٹتے ہوئے اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ ایسی کرب ناک کہانی ناطق کی ہی کاوش ہو سکتی ہے۔ انگریزوں کے راج میں غربت و افلاس کی زندگی گزارتے لوگ جن کو جبری تشدد اور مشقت جیسی زندگی گزارنا پڑی۔ طاقت کا زور تھا اور غریب محکوم کو اختیار بھی نہیں تھا کہ وہ حاکم تک اپنی بات پہنچا سکتا۔ وہ لوگ جن کے پاس چالاکی اور عیاری جیسی دولت تھی وہ گورنمنٹ کی نظر میں اعتبار حاصل کرنے کے لیے کامیاب رہے۔ قانون ہر کسی کی جاگیر تھا۔ جو مال دار تھے قانون کو خرید لیتے تھے۔ کلرک افراد نے بھی لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ کسی کی زمین کسی کے بھی نام کر دیتے تھے اور اپنے ساتھ ایسا ہوتا دیکھ کر ہمت پست ہو جاتی تھی۔

جب کوئی ذرا سی آواز اٹھانے کی کوشش کرتا تو اس کی آواز کو دبا دیا جاتا۔ تھانیدار پرچہ ہی نہ کاٹتے، ذاتی عناد پر لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے اور سالوں تک چلتے رہتے اور رہی سہی کسر ملاؤں نے نکال دی، وہ اپنی ہی ایک دنیا بنا رہے تھے۔ رشوت کے زور پر اپنا کام نکلوا لینا لوگ فن سمجھتے تھے، عوام کا استحصال کیا جاتا تھا، بھاری ٹیکس لگا کر غریبوں کی ہمت پست کرنا اور اسی روپے کی وجہ سے عوام نے حکومت پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ جہالت عام ہوگئی، ہندو آڑھتی قابض ہو گئے، طاقت کے نشے میں ہر کوئی مست نظر آتا تھا، الیکشن میں دھاندلی عروج پر تھی۔ اگر کوئی اپنا حق استعمال کرنے کی سوچتا بھی کہ وہ اپنا لیڈر خود منتخب کرے تو وہ بھی بیکار تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ سکھوں کی جنگیں، قتل و غارت اور تقسیم ہند کے دل دہلا دینے والے واقعات اور مہاجرین کے ساتھ ناروا سلوک یقیناً یہ سب ناطق کے ہی ذہن کی کاوش ہوسکتی ہے۔ یہ ناول ان کی نثری تخلیق کی ابتدا کہلاتا ہے اور انھوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ ان کے کمال فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

انہیں پنجاب اور پنجاب کی زمین سے بے پناہ محبت ہے۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں پنجاب کی ثقافت کی نہ صرف جھلک بلکہ خوشبو موجود ہے۔ جزئیات نگاری پر انہیں عبور حاصل ہے۔ یہ جزئیات نگاری کا ہی کمال ہے کہ ناول میں کوئی بھی واقعہ نامکمل نہیں ہے۔ اس سے متعلق ایک ایک بات کو کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ پلاٹ اس قدر سادہ اور مربوط ہے کہ ایک عام قاری کو بھی ناول پڑھتے ہوئے اس کی مکمل سمجھ آجاتی ہے۔ ایک کے بعد ایک ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جو قاری کو چونکا کر رکھ دیتے ہیں۔ تمام واقعات کڑی کے ساتھ کڑی کی صورت ہاتھ ملاتے ہیں۔ وہ کہانی کو اس طرح سناتے ہیں کہ گویا وہ شروع سے لے کر آخر تک موجود تھے اور سارے واقعات ان کی آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے ہیں۔ نولکھی کوٹھی کے کردار مکمل طور پر آزاد ہیں۔ کہیں بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ ناول نگار کے ہاتھ میں چھڑی ہے اور وہ ان کو ہانک رہا ہے۔ ولیم کا کردار جس طرح سے ناول نگار نے پیش کیا ہے، جیسے جیسے وہ ارتقائی منزل طے کرتا ہے، ایک ہیرو کی طرح منظر پر نمایاں ہوتا ہے۔ بچپن اور جوانی کی عیش و عشرت سے ہوتا ہوا یہ کردار بڑھاپے میں محرومیوں اور ناانصافیوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور اس طرح قاری کو ولیم سے بے حد محبت ہو جاتی ہے۔ بلا شبہ و مبالغہ ناطق کو کہانی سنانے کا خوب فن آتا

ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی نفسیات سے باخبر ہے۔ یوں گمان ہوتا ہے کہ علی اکبر ناطق، ناول نہیں لکھتا ، بلکہ ناول اسے لکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ حسین انتظار، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2014ء، ص بیک فلیپ

2۔ حسینی، علی عباس ،اردو ناول کی تاریخ و تنقید ،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1994 ء، ص233

3۔ احد، امتیاز، روزنامہ صدائے مسلم، راولپنڈی، 2021، 10 فروری ص4

4۔ الہدیٰ، نجم، کرداراور کردار نگاری، بہار اردو اکادمی، مظفر پور، 1980ء، ص44

5۔ ناطق، علی اکبر، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، لاہور، 2014ء، ص86

6۔ ناطق، علی اکبر، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2014ء، ص42

7۔ نیئر، ناصر عباس، حصیت شعر، اسوہ کالج، اسلام آباد، 2016، ص، بیک فلیپ

8۔ اقبال، ظفر، دال دلیا، روزنامہ دنیا، 2015ء، 25 جولائی

9۔ ناطق، علی اکبر، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز ،لاہور، 2014ء، ص14

10۔ ایضاً، ص18

11۔ ایضاً، ص32، 33

12۔ ایضاً، ص33

13۔ ایضاً، ص21

14۔ ایضاً، ص38

15۔ ایضاً، ص44

16۔ ایضاً،ص48 17۔ ایضاً،ص49

18۔ ایضاً،ص76 19۔ ایضاً،ص59

20۔ ایضاً،ص190 21۔ ایضاً،ص112

22۔ ایضاً،ص117 23۔ ایضاً،ص125

24۔ ایضاً،ص203 25۔ ایضاً،ص209

26۔ ایضاً،ص210 27۔ ایضاً،ص116

28۔ علی،ابوالحسن،سید ایک اہم دینی دعوت یا عمومی تعلیم وتربیت کا نبوی نظام،ناظم مکتبہ الفرقان بریلی،پولی،سن،ص7

29۔ علی،ابوالحسن،سید،ایک اہم دینی دعوت یا عمومی تعلیم وتربیت کا نبوی نظام،ص30

30۔ ناطق،علی اکبر،نولکھی کوٹھی،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،2014ء،ص226

31۔ ایضاً،ص227 32۔ ایضاً،ص228

33۔ ایضاً،ص228 34۔ ایضاً،ص267

35۔ ایضاً،ص356 36۔ ایضاً،ص357

37۔ ایضاً،ص363 38۔ ایضاً،ص357

39۔ رسول،غلام مہر، 1857 پاک و ہند کی پہلی جنگ کے مستند و مکمل حالات،کتاب منزل لاہور،س ن،ص10

40۔ ناطق،علی اکبر،نولکھی کوٹھی،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور 2014ء،ص374

41۔ ایضاً،ص380 42۔ ایضاً،ص382

43۔ ایضاً،ص385 44۔ ایضاً،ص393

45۔ ایضاً،ص393 46۔ ایضاً،ص396

☆☆☆☆☆☆☆

"کماری والا" میں پس ماندگی کے مظاہر

دسمبر 2020ء میں ناطق کا دوسرا ناول کماری والا ہندوستان سے شائع ہوا۔ ''نولکھی کوٹھی'' ناول کی صورت میں نثر میں پہلی کامیابی کے بعد یہ ان کی دوسری کاوش ہے۔ اردو ادب میں ایسے ضخیم ناول بہت کم ہیں۔ مصنف کے ناول اردو ناول کی تاریخ کے لیے روشن باب کی طرح ہیں۔ ناول میں اس نے رواں نثر کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ کسی بھی اچھے ناول کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کی نثر رواں ہو، جزئیات نگاری سے کام لیا گیا ہو اور آسان ہو۔ اس نے اردو ادب میں جو نئی چیز کا اضافہ کیا وہ بیان کی علاقائی زبان کے الفاظ۔ بھلے ہی الفاظ کو صرف اس علاقے سے تعلق رکھنے والا فرد ہی پڑھ سکتا ہے لیکن رواں نثر ہونے کی وجہ سے قاری جب نثر میں آنے والے نئے الفاظ کو پڑھتا ہے تو جلد ہی اسے ان الفاظ کی سمجھ آجاتی ہے کہ وہ اس سے یہ بات سمجھانا چاہ رہے ہیں اور یقیناً یہ ایک نئے اضافے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ کاوش و تخلیق بھی ہے۔

ناول میں ایک علاقائی خوشبو آتی ہے، جو الفاظ کے ذخیرے میں بھی اضافے کا باعث بنتی ہے۔ مصنف نے کہانی کو بہت عمدگی سے پھیلایا ہے۔ ایک ایسی کہانی جو نسلوں پر محیط ہے۔ جس علاقے کی بات وہ کر رہے ہوتے ہیں اس کے بارے میں وہ تفصیلاً بتاتے ہیں۔ وہاں کا رہن سہن، ماحول،

آب و ہوا، علاقے کے خدوخال، یہاں تک کہ وہاں کے مشہور و مصروف لوگ، سوغات اور اچھی بڑی تمام باتوں کو اس طرح بتاتے ہیں کہ ہر نیا پڑھنے والا قاری جو پہلی بار اس علاقے کے بارے میں پڑھ رہا ہے وہ جان جاتا ہے کہ یہ علاقہ اس طرح کا ہے۔ جیسے وہ چاہتے ہیں کہ ان کا قاری بھی مکمل طور پر مانوس ہو جائے، اس علاقے سے، ماحول سے تاکہ وہ پڑھتے ہوئے خود کو اس ناول کا ایک حصہ محسوس کرے اور یقیناً وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔

ناول کی کہانی مصنف نے ایک ایسے تعفن زدہ سماجی ماحول پر لکھی ہے جو تمام دنیا سے پرے الگ اپنی جڑیں مضبوط کرتا نظر آ رہا ہے۔ یقیناً یہ ایک دلیرانہ کاوش ہے۔ اگر ان باتوں کو بے نقاب کیا جائے اور کوئی عملی کارکردگی کی جائے تو اس سے ایسے ماحول کی جڑیں کمزور کی جا سکتی ہیں۔ یہ ناول جن باتوں کی وجہ سے خاص طور پر اردو ادب میں جانا جائے گا وہ دراصل ملک کے مذہبی زوال کی عکاسی ہے۔ جہاں نئی نسل غلط راستوں پر چل نکلی ہے۔ نہ صرف لڑکیوں کے لیے بلکہ لڑکوں کے لیے بھی معاشرہ تنگ نظر ہوتا جا رہا ہے۔ نوخیز نسل کے لیے ان کی عصمت کی حفاظت ایک معمہ بن چکی ہے۔ ان کی عصمت دری کی جاتی ہے، اغوا کیا جاتا ہے اور پھر باہر ممالک میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی ان پر کارروائی کرنے کی کوشش بھی کرے تو انہیں دہشت گردی کے کیس میں ملوث کر دیا جاتا ہے۔ جس پر انہیں سوائے معاشرے سے فرار کے اور اپنی موجودہ صورتحال پر صبر کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ملتا یہ ایک کاروبار کی طرح ناطق کی کہانی میں بتایا گیا ہے کہ ایک پورا گروہ ہے جو ان کاموں میں ملوث ہے اور مذہبی رہنما مذہب کے نام پر سفید پوشی کے پیچھے چھپ کر حکومت کے اعلیٰ افسران کے ساتھ سودا بازی کرتے ہیں اور اس قدر صفائی سے کہ کوئی ان پر شک بھی نہیں کرتا اور کوئی ان کی طاقت کی وجہ سے ان پر ہاتھ بھی نہیں ڈالتا۔ اس طرح معاشرے میں عام فرد بالکل پس کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ان طاقتوں کے آگے بالکل بے بس ہے۔

ناول نگار نے یہ ناول لکھ کر بہت جسارت کا کام کیا ہے۔ اس کے مطابق پاکستان کا وجود میں آنا ہی تنگ نظری کے باعث ہوا تھا۔ شیعہ مسلک کے ساتھ زیادتی کے واقعات کو دکھایا گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کوئی کسی بھی مذہب وعقیدے کا ہو معاشرے میں اسے پر اعتماد زندگی گزارنے کا پورا حق ہے۔ ناول میں جو انتہائی شرمناک پس ماندگی کو عیاں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حکومتی سطح پر لوگ اپنا کام

نکلوانے کے لیے اپنی بہو بیٹیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ان کے ذریعے وہ اپنی عزت بنا کر بیٹھے ہوتے ہیں اور اس کاروبار کو غلط بھی نہیں کہتے۔

اس اخلاقی پس ماندگی کے لیے قدم اٹھانا خود ناطق کے لیے بھی ہمت کا کام رہا ہوگا۔مصنف بہت ہی دانش مندی سے زندگی کے تجربات کو ناول کے ذریعے پیغام کی صورت میں پہنچاتے ہیں اور زندگی میں ہونے والے بہت سے ایسے واقعات جن پر کوئی بات نہیں کرتا ناطق نے ان باتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔بہر حال یہ ناول اپنے عہد کا قابل ذکر ناول ہے۔

ناول کی کہانی کہیں کہیں بہت پیچیدہ موڑ پر نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ہر موڑ پر ایک نئی کشمکش کا سامنا رہتا ہے۔ناول میں مرکزی کردار ضامن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جسے آپ بیتی سنا رہا ہو کہیں مضمون کا احساس ہوتا ہے کہ قاری کو دوبارہ کچھ پچھلے صفحات پڑھنے کے بعد اصل بات کی سمجھ آتی ہے۔بہر حال قاری کیلئے یہ بہت دلگیر لمحات ہیں۔جن واقعات کو بیان کیا گیا ہے ایسے واقعات انسانی زندگی کیلئے ایک کٹھن آزمائش ہیں۔ضامن کی زندگی مسلسل سفر کی نذر ہوگئی کبھی وہ کام کے سلسلے میں رہا،کبھی زندگی کی آزمائش کو جھیلنے کے، یہ سفر بہت طویل رہا اور پھر شیزہ کی موت واقع ہونے پر ختم ہوا یا شاید قاری کے ذہن میں جیسے تاثر رہ جاتا ہے کہ اگر ضامن یہ اپنی کہانی بتا رہا ہے تو سفر تو پھر بھی مسلسل رہا۔شروع میں پڑھنے سے ایک گاؤں کی عام زندگی کا احساس ہوتا ہے جہاں لوگ سادہ زندگی گزارتے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی غیر مناسب حادثہ ہو جانے پر واویلا مچاتے ہیں۔پھر جب وہی کہانی گاؤں کی سادہ زندگی سے نکل کر شوبز نس تک جا نکلتی ہے تو دل سے ایک آہ نکلتی ہے کہ انسان کس طرح خود بخود اس گول دنیا میں ایک گیند کی طرح اچھلتا چلا جاتا ہے۔بہر حال ناول انتہائی گہرائی میں لے جاتا ہے بہت سی باتیں دل ہی دل میں ان کہی رہ جاتی ہیں کتنے دن تک قاری اس کہانی کے سرا سے نکل نہیں پاتا۔عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> ''قدرت نے انسان میں تجسس کا مادہ ودیعت کیا ہے اس بنا پر وہ کچھ جاننے کی کوشش کرتا ہے۔چنانچہ ایک کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سامعین یا قاری کے اس ذوق تجسس کو برقرار رکھے''(1)

ناول نگار نے تجسس کا عنصر کہانی کے شروع سے آخر تک برقرار رکھا ہے۔قاری پڑھتے

ہوئے جلد از جلد جان لینا چاہتا ہے کہ کہانی کس موڑ پر جا کر رکے گیا وریہی تجسس کا مادہ لیے جب قاری ایک کے بعد ایک صفحات کو پڑھتا جاتا ہے تو خود کو بھول بھلیوں میں گم ہوتا محسوس کرتا ہے۔ واقعات کا آپس میں مصنف نے جو ربط بنایا ہے وہ نسلوں پر محیط ہے۔ ایک کڑی کا سرا دوسری کڑی کے ساتھ بہت مہارت کے ساتھ ملایا ہے اور یہ بات قاری جب پڑھتا ہے تو گویا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے کوئی معمہ حل کر لیا ہے اور ایک غار جس میں جانے کے بعد اسے تین چار الگ الگ راستے نظر آ رہے تھے اور اب اسے کامیابی کا راستہ مل گیا ہے۔ وہ باہر نکل آیا ہے اور تجسس کی گتھی کو بھی سلجھا آیا ہے۔

پلاٹ

ناول کا پلاٹ بہت خوبصورت انداز میں گتھا ہوا ترتیب دیا گیا ہے۔ ناطق جس پس ماندگی کو عیاں کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اسے شروع میں اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اصل میں ایک معمولی جڑ کیسے ایک مضبوط تناور درخت بن جاتی ہیاور جب اس تناور درخت نے اپنی جڑیں اور شاخیں پھیلا دی ہوتی ہیں۔ تو اسے ہٹانا کتنا مشکل عمل ہے۔ لوطی حرکات سے شروع ہوتی یہ کہانی پھر سیکس انڈسٹری تک جا پہنچی یہ معاشرتی پس ماندگی ایک مضبوط جڑ کی طرح معاشرے کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اس نے بہت اعلیٰ طریقے سے پردہ سرکایا ہے۔ کہانی کا پلاٹ بہت مضبوط و منظم ہے مصنف کی گرفت کہانی کے پلاٹ کے علاوہ مکالمے اور جزئیات نگاری پر بھی آخر تک قائم رہی۔ تلخ حقائق کو نمایاں کرنے میں ناطق نے ایک دلیرانہ جسارت کر کے معاشرے کے سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

''کہانی اگر قصہ کی بنیاد ہے تو پلاٹ اس کی تزئین و آرائش ہیں''(2)

مصنف نے اس غیر عادلانہ اور استحصال پذیر معاشرے میں اپنی کہانی کیذریعے غیر انسانی رویوں کو بے نقاب کیا ہے اور اس بے حس معاشرے کی بہتری کے لئے ایک مضبوط پلاٹ مرتب کیا ہے۔ جس میں شروع سے آخر تک مسلسل ایک سحر بھی قاری پہ قائم رہتا ہے اور دوسرا معاشرے میں موجود غیر انسانی رویوں اور اخلاقی پس ماندگیوں کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

کردار

ناطق کے ناول ''کماری والا'' میں تمام کردار متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ ''ضامن'' کہانی کا

مرکزی کردار ہے۔''طلال'' نے جو کردار پیش کیا یقیناوہ بھی ایک بھاری ذمہ داری پوری کر رہا ہے جس کی وجہ سے باقی تمام کردار متحرک دکھائی دیتے ہیں۔شروع میں قاری کو لگتا ہے کہ''زینت'' کہانی کا مرکزی کردار ہے۔مگر جب کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے تو یہ تمام کہانی اصل میں''شیزہ'' کے روپ میں سمجھ آتی ہے۔باقی تمام کردار جس میں''حسنات اور حاجی فطرس'' ہیں یہ بھی کہانی کا اہم حصہ دکھائی دیتے ہیں۔

کہانی میں بتائے گئے تمام کرداروں کا آپس میں ایک ربط ہے اور اسی ربط پر کہانی ایک پٹڑی پر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ناطق کی کہانیوں کے تمام کردار حقیقی زندگی کے قریب محسوس ہوتے ہیں۔

کرداروں کی تخلیق بھی مصنف کہانی کے مرکزی خیال اور پلاٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے کرتا ہے مگر وہ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ کردار معاشرے کے اندر سے ہی انتخاب کیے جائیں جن کو پڑھنے کے بعد قاری کو حقیقت کا احساس گھیرے۔کسی بھی کہانی میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔انھیں دیکھنے، سننے اور پڑھنے میں دلچسپی کم ،قاری کی دلچسپی اس بات میں زیادہ ہوتی ہے کہ کس کردار کے ساتھ یہ واقعات پیش آرہے ہیں اور کیوں؟ناطق نے کرداروں کے بارے میں بہت باریک بینی سے کام لیا ہے اور حقیقت پر مبنی کردار نگاری کی ہے۔عظیم الشان صدیقی کے مطابق:

> ''کہانی کے واقعات جس ذریعہ سے ظہور میں آتے ہیں کردار کہلاتے ہیں۔ہم میں سے بہت سے لوگ اگر یہ جاننا بھی چاہیں کہ کیا حادثہ ہوا لیکن یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ یہ واقعہ کس کے ساتھ پیش آیا۔''(3)

مصنف رشتوں میں پائی جانے والی تڑپ،غم اور خلش کو کرداروں کے ذریعے جس طرح سیسامنے لے کر آتے ہیں۔وہ ایک مقناطیسی فضا قائم کرتے ہیں جو قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور اسے اپنا گرویدہ بنالیتی ہے۔

ناول میں کرداروں کی بہتات ضرور ہے لیکن ہر کردار اپنا الگ ہی روپ لے کر سامنے آتا ہے جو روایتی انداز کا تسلسل بھی قائم رکھتا ہے اور نیا پن بھی۔ناول نگار نے اپنے تخیلات اور محسوسات سے یہ کردار تراشے ہیں جو حقائق اور معاشرتی اقدار کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔وہ لکھتے

ہیں ہوئے قاری کو ذہن میں رکھتے ہیں ایک عام آدمی کا ذہن اوراس کے خیالات کس نوعیت کے ہیں۔قاری ہمیشہ سے اس بات کو جاننا چاہتا ہے کہ جو حادثہ پیش آیا وہ کس کردار کے ساتھ پیش آیا ہے یہ قاری کی دلچسپی کی نمایاں وجہ ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگار کیلئے بھی ایک چیلنج ہوتا ہے اور ناطق اس میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

جزئیات نگاری

ناطق نے ناول میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے عصری دور میں جزئیات نگاری کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔مصنف نے اس کے برعکس اپنے ناول ''کماری والا'' میں جزئیات نگاری کو بڑھا دیا ہے اور ہر ایک واقعے کی جزئیات کو بیان کیا ہے۔اس طرح ایک طرف تو تحریر میں خوبصورتی پیدا ہوئی پر ساتھ ساتھ کہانی غیر ضروری طوالت میں چلی گئی۔وہ اپنی زندگی میں جن حالات سے گزر چکے ہیں انھوں نے ان سب کو بتانے کی کوشش کی ہے۔ایک ایک پل کو اس طرح بتایا ہے کہ قاری ''ضامن'' کی زندگی کو جزئیات نگاری کی وجہ سے مکمل جانتا ہے وہ کب،کس پل،کہاں،کیا کرتا ہے سب باتوں کو ناطق نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔بات یہ بھی درست ہے کہ جب قاری ناول پڑھتا ہے تو اسے خود حالات و واقعات کو مکمل جان لینے کی دھن ہوتی ہے۔اس لیے اگر مصنف نے ان حالات کو مدنظر نہ رکھا ہوتا تو ناول صرف ایک بیانیہ کہلاتا۔جزئیات نگاری قاری کی دلچسپی کو بڑھاتی ہے۔مصنف نے بھی ناول میں مکمل ماحول کا نقشہ قاری کے ذہن میں ابھارا ہے اپنی جزئیات نگاری کی مدد سے یہ قاری کیلئے انہماک کا ذریعہ ہے۔

مقصد حیات

ہم جو بھی پڑھتے ہیں اس سے متاثر ضرور ہوتے ہیں۔اسی طرح ناول نگار بھی کسی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور جس زندگی کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے وہ مقصد سے خالی نہیں ہوتی۔ناول نگار قاری کیا حساسات کے بارے میں آگاہ ہوتا ہے۔اس لیے وہ انسانی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ایک کہانی تخلیق کرتا ہے۔ایک استاد کی طرح اپنی بات کو قاری کے ذہن تک پہنچانے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہوتا

ہے کہ ایک خاص قسم کا فلسفہ اس کے ذہن میں زبردستی ڈالا جاتا ہے۔

ناول نگار نے بھی ایک مقصدی کہانی لکھی ہے۔ وہ اپنی اس کہانی کے ذریعے ہمیں کرپشن اور ملک سے غداری کرنے والوں کو بینقاب کر رہے ہیں۔ وہ سیکس انڈسٹری کی ایک واضح تصویر اور اس کے نتائج کو ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں جو کہ ایک عمدہ قدم ہے۔ یقیناً نولکھی کوٹھی کے بعد ناطق کا یہ دوسرا انتہائی شاندار ناول ہے جو یاد رکھے جانے کے قابل ہوگا۔ ہر موڑ قاری کو ایک نئی راہ سے متعارف کروا رہا ہے شوبز کی دنیا ایک جھانسہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں چلتے پھرتے لوگوں کے بارے میں خلاصہ کیا گیا ہے۔ جائیداد کا لالچ تو ایک الگ بات، اس پہ نسل در نسل بات پر اس طرح مٹی ڈال دی جاتی ہے کہ وہ ایک معمہ بن جائے اور حل نہ ہو پائے۔ ناطق نے بہت ہی جانب داری کا مظاہرہ کیا ہے اور محسوسات کے مطابق ایک مقصدی کہانی لکھی ہے۔

پس ماندگی کے مظاہر

''کماری والا'' میں مصنف نے دیہی علاقے سے کہانی کا آغاز کیا۔ وہاں کا ماحول، ثقافت، سادگی اور غربت و افلاس کی زندگی گزارتے ہوئے لوگوں کی مجبوریاں بیان کی ہیں لیکن یہ ناول کب ان باتوں سے ان پیچیدہ حالات کی طرف رخ کر لیتا ہے جہاں زندگی خود ہی مجبوری لگنے لگتی ہے۔ ملکی حالات ہوں، دیہاتی زندگی ہو، شوبزنس کی چمکتی دنیا ہو، سیاسی ایجنڈا ہو یا پھر مذہبی تکرار ناطق نے ہر ایک کو اپنا موضوع بنایا اور ناول کے ذریعے معاشرے کے سامنے معاشرے ہی کی پس ماندگیوں کو عیاں کیا یقیناً اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے، انھیں تخیل پر عبور حاصل ہے۔ وہ اپنے قلم کی طاقت سے حقیقت کے قریب کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کی سوچ میں جیسے قاری کا نقشہ ابھرتا ہے اور معاشرے کا عمیق اور غائر مطالعہ کرنے کے بعد وہ بالکل قاری کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان بعض اوقات ایک وقت میں کئی زندگیاں گزار رہا ہوتا ہے۔ ایک پہ بہرحال وہ پردہ رکھتا ہیا اور اس پردے کے پیچھے چھپی زندگی ہی آہستہ آہستہ اس پر زندگی کا گھیرا تنگ کر دیتی ہے۔

اس نے کرداروں کی ایک ایسی بستی بسا رکھی ہیجو محسوس ہوتا ہے کہ مکالمے یا منظر نگاری کی

وجہ سے نہیں بلکہ کرداروں کی وجہ سے کہانی پروان چڑھ رہی ہے۔وہ معاشرے میں رہتا ہوا ایک عام سا انسان ہوتا ہے اور اپنی زندگی کے تجربات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔وہ اردو ادب میں ایک بہت ہی اعلیٰ اضافہ ہیں اس ناول نے انھیں اردو ادب کے ادیبوں میں شمار کر دیا ہے۔کماری والا کی تخلیق مصنف کی ایک منفرد کاوش ہے اس منفرد تخلیقی فن کاری نے انھیں ایک نئی پہچان دی ہے لفظوں میں چھپے ان کے مطلب اپنے اندر سمندر جیسی وسعت رکھتے ہیں۔ایک ایسا گہرا سمندر جس کی تہہ میں بے شمار موتی چھپے ہیں۔وہ دور عصر کے منفرد لکھاری ہیں۔ناول میں جن پس ماندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے اب ان کا فکری جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

دیہات میں قابل ڈاکٹروں کا فقدان

آج تک یہ المیہ ہی بنا ہوا ہے کہ شہروں میں زیادہ سہولتیں ہوتی ہیں اور دیہاتوں میں زندگی سہولتوں سے دور ہوتی ہے۔اسی بات کی وجہ سے لوگ شہروں کا رخ کر لیتے ہیں اور دیہاتوں میں پہلے سے بھی کم لوگ رہ جاتے ہیں۔جو افراد تعلیمی میدان کو فتح کر لیتے ہیں تو وہ دیہات میں رہنا پسند نہیں کرتے ،بوریا بستر سمیت شہروں کی طرف نکل پڑتے ہیں۔جیسے وہ پڑھائی ہی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ شہروں کی طرف زندگی کو لے جا سکیں۔

ناطق نے بھی کہانی کے آغاز میں قاری کی توجہ اسی طرف مبذول کرائی ہے کہ دیہاتی زندگی بہت سادہ ہوتی ہے۔جہاں قابل ڈاکٹروں کا فقدان ہوتا ہے قابل ڈاکٹرز کا اس لیے کہ وہاں جو کوئی سیانا ہوتا ہے تو اسے علاج معالجے کیلئے مقرر کر لیا جاتا ہے۔وہ اب چھوٹی موٹی بیماریوں بخار،زکام ،گلہ خراب جیسے امراض کا تو علاج کر سکتا ہے مگر بڑے مسائل کو حل کرنا اس کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔

دیہات میں خواتین اور ان کے نومولود بچوں کے حوالے سے بھی بہت سے مسائل کا سامنا رہتا ہے اور پورے علاقے میں زچگی سینٹر نہ ہونے کی وجہ سے اکثر انہیں جان سے بھی جانا پڑتا ہے۔ناول نگار نے بھی کہانی میں ایک سیانی عورت کا ذکر کیا ہے جو کہ دراصل خود کی پناہ کیلئے اس علاقے میں بسی اور پھر وہاں لوگوں کا علاج معالجہ کر کے گزارا شروع کر دیا اور اس علاج معالجے کا تجربہ اس عورت کو اس لیے تھا کہ اس کی ماں نرس تھی اور ماں کو دیکھ کر وہ کافی کچھ سیکھ چکی تھی۔

''میری بیوی کا سارا علاج معالجہ اس نے کیا۔تمہیں تو ہماری مشکلوں کی خبر نہیں پر یہاں آدھی عورتیں بچہ پیدا کرتے ہوئے مر جاتی ہیں۔غریبوں کے پاس نہ چنگا کھانے کو ہے اور نہ چنگی دوائی ملتی ہے''(4)

دیہاتی زندگی میں بہت سے مسائل کے ساتھ جہاں انسان گزارا کر رہا ہوتا ہے وہاں یہ بات بہت تکلیف دہ ہے کہ جب کوئی اپنا بیمار ہو جاتا ہے اور اسے ایمرجنسی علاج کی ضرورت ہوتی ہے ایسے میں اسے علاج کیلئے شہر سفر کر کے جانا پڑتا ہے اور اس دوران اکثر مریض کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پیدائش سے پہلے ہی بعض اوقات عورتوں کو اچھا علاج نہ ملنے کی صورت میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور رہی سہی کسر یہ الیکشن کے نزدیک ووٹ لینے والے نکال لیتے ہیں۔جو ہر سال وعدہ تو کرتے ہیں اسپتال بنانے کا اور ڈسپنسری کے انعقاد کا لیکن جیسے ہی ان کی ضرورت پوری ہوتی ہے وہ وعدہ خلافی سے کام لیتے ہوئے اپنی بات سے مکر جاتے ہیں ڈاکٹرز کا فقدان گاؤں میں یہاں شہری سہولیات سے دوری بھی ہے کچھ لوگ اپنے لائف سٹائل کو بھی بدلنے کی خاطر گاؤں کے لوگوں کے بارے میں نرم دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔زمینداروں اور وڈیروں کا ایسا رعب و دبدبہ ہوتا ہے۔گاؤں میں غریب عوام کی کثرت زیادہ ہے جو اپنے کم وسائل ہونے کی وجہ سے یہاں زندگی گزارنے پہ مجبور بھی ہیں اور کٹھ پتلی بھی بنے رہتے ہی اور صرف زمینداروں کا منہ دیکھتے رہتے ہیں کہ وہی کچھ گاؤں کے حالات بدل سکتے ہیں۔ناطق نے ناول کے ذریعے دیہاتی زندگی اور وہاں کے لوگوں کو مجبور حالات میں گزارا کرتے ہوئے دکھایا ہے۔شہر کی زندگی میں جو آسائشیں ہیں گاؤں کے لوگ نہ صرف ان سے محروم ہیں بلکہ مجبور بھی ہیں۔

''میاں تو ڈاکٹر کو روتا ہے، یہاں اسپرو کی گولی لینے کیلئے ستر میل دور جانا پڑتا ہے۔کئی بار ووٹیں لینے والے آئے ،ہسپتال کا وعدہ کرتے ہیں، ووٹ لیتے ہیں پھر اگلے پانچ سال تو کون اور میں کون''(5)

مصنف نے بہت ہی قابل غور بات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ یہ ووٹ لینے والے لوگ ہر سال وعدہ کرتے ہیں۔ان لوگوں کی سادگی کے ساتھ کھیلتے ہیں اور پھر واپس پلٹ کر خبر بھی نہیں

لیتے کہ کون کس حال میں ہے۔ گاؤں میں دکھاوئے کے نام پر ایک ڈسپنسری ضرور ہوتی ہے جس کا فائدہ بس یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی سرکاری دورہ ہوتا ہے تو یہ نشان موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے پکڑ ہونے سے بچ جاتے تھے۔ ایک لمبے عرصے سے یہاں گاؤں میں بھی ایک ڈسپنسری موجود تھی۔

مصنف اس کا احوال کچھ یوں بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر اور نرسیں تبدیل ہوتی رہتی تھیں، کوئی تکتا ہی نہیں تھا۔ ڈسپنسری ہر وقت خالی ہونے کی وجہ سے لڑکے یہاں کرکٹ کھیلتے نظر آتے تھے۔ دیکھنے میں ایک بڑی عمارت جس میں رہنے کیلئے کوارٹرز بھی موجود تھے مگر پھر بھی اس ڈسپنسری کو ناطق نے بالکل ویران اس لیے بتایا ہے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ گاؤں میں لوگ ڈاکٹرز کے نہ ہونے کی وجہ سے کیسی زندگی گزارتے ہیں، ان کو کیا حالات پیش آتے ہیں جب وہ کسی حادثے کا شکار ہوتے ہیں کہیں ناطق نے ایسا نقشہ بھی کھینچا ہے کہ کمپوڈر ہی خود کو ڈاکٹر سمجھنے لگتے ہیں اور بعض اوقات اپنے ناجائز کاموں کیلئے بھی ڈسپنسری کو استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر اور نرسیں گاؤں کے ہسپتال میں مستقل نوکری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حکومت ہر نئے ڈاکٹر اور نرس کو سال چھ مہینے گاؤں کے ہسپتالوں میں بھیج کر تجربات کرواتی۔ جب وہ یہاں سے اچھی ٹریننگ لے لیتے تو ان کی شہر کے ہسپتال میں تعیناتی کر دی جاتی ہے اور دیہات میں نیا میڈیکل سٹوڈنٹ بھیج دیا جاتا'' (6)

یعنی دیہات کے ہسپتالوں کو صرف ٹریننگ سینٹرز کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ وہاں مستقل سکونت اختیار کرنا وہ بھی اپنے لیے قباحت خیال کرتے ہیں۔ کچھ ایسی وجوہات بھی تھیں جن کی وجہ سے ڈاکٹر گاؤں کا رخ نہیں کرتے تھے اگر کسی مریض کی جان چلی جاتی تو وہ اس پر ذمہ دار ڈاکٹر کو ہی ٹھہرا کر اسے مارنا شروع کر دیتیں اور ان گاؤں کے لوگوں کی اس حرکت کے ڈر سے بھی شہروں کی طرف ہی بھاگتے ہیں اور گاؤں کا رخ نہیں کرتے۔

ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر انہوں نے بھی کہانی میں کیا ہے۔ جب ایک بوڑھے کو ڈسپنسری میں اٹھا لائے اس کے ساتھ آدھا گاؤں تھا وہ مریض پہلے ہی قریب المرگ تھا۔ جب ڈاکٹر نے اس کا معائنہ

کیا تو بوڑھے کا جسم اکڑ گیا اور قلابازیاں لگانا شروع کر دی۔ ڈاکٹر آنے والے اتنے لوگوں کا غصہ دیکھ کر پریشان ہو گیا اور پھر بروقت اینٹی الرجک انجیکشن نہ ہونے کی وجہ سے مریض کی حالت ان کے اختیار سے باہر ہو گئی اور ڈر کر کمرے میں بھاگ گیا مریض شدید اذیت سے دوچار ہو کر فوت ہو گیا۔ اس پر گاؤں کے لوگوں کا رویہ ناطق نے یوں بیان کیا ہے کہ نہ صرف سہولیات کی کمی سے وہ لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہیں، بلکہ تعلیمی اور معاشرتی تربیت کی کمی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔

> ''آخر انھوں نے ڈاکٹر کو ٹانگوں سے پکڑ کر چوہے کی طرح باہر کھینچ لیا اور مارنا شروع کر دیا۔ ڈسپنسری میں ایک شدید قسم کا ہنگامہ ہو گیا۔ اس شور شرابے کے عالم میں لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے لیکن اس سے پہلے کہ لوگ ڈاکٹر کو بچاتے انھوں نے ڈاکٹر کی ٹانگ توڑ ڈالی''(7)

یہاں ایسی صورت حال میں بھی ڈاکٹرز شہروں کا ہی ہونا پسند کرتے ہیں اور دیہی زندگی میں سہولیات کی کمی اور پھر لوگوں کے غیر مناسب رویہ سے بھی خود کو دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں بہر حال یہ ایک پس ماندگی ہے عصر حاضر میں بھی دیہاتی علاقوں کا حال کچھ ایسا ہی ہے۔ ڈاکٹرز کا فقدان ہے اور دیہاتی زندگی شہری زندگی کی نسبت ترقی سے ابھی بھی دور ہے۔

لوطی حرکات ہم جنس پرستی

یہ انسانی معاشرہ ہے انسان خطا کا پتلا ہے، لیکن ابلیس کے پیروکار یہ لوگ اسی انسانی معاشرے میں بظاہر خود پر انسانیت کا لبادہ اوڑھے حیوانیت کو ترویج دیتے ہوئے، انسانی حدود سے ہی باہر نکل جاتے ہیں۔ نا صرف خود اس کام میں شامل ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو بھی ملوث کرنا چاہتے ہیں۔ اچھی سوچ و بصیرت کا مالک ایسے گندے کام سے کراہت محسوس کرتا ہے اور خود کو غلاظت سے پاک رکھتا ہے۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو کیونکہ وہ انسانی حدود کو جانتا ہے لیکن کچھ جو انسانی حدود سے نکل کر جنسی آزادی کو خود پر لازم اور خود کو آزاد سمجھتے ہیں وہ خود کو حیوانیت کی حدود سے باہر خارج کر دیتے ہیں۔ اس آزادی کا نام ہم جنس پرستی ہے۔ ایسے ہی فلسفے کا پرچار کرنے والے یہ لوطی کسی بھی رکاوٹ کے

دائرے میں نہیں آتے اور اپنی تسکین کے لئے، ہر رشتے کو خود کے لیے جائز اور حلال سمجھتے ہیں۔ یہ سراسر شیطانی وصف ہے۔ رحمانی وحی کے خلاف ہے یہ کام اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے مگر انسان اپنا عرفان بھول چکا ہے۔ جو ذہن ہدایت سے اندھا ہو چکا ہے تو اس کی آنکھیں، کان، زبان سب بیکار ہیں وہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ کا ایندھن بنالیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

سورت الاعراف کی آیات کا ترجمہ: آیات 80،81

''اور جب لوط نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایسی بے حیائی کرتے ہو جو تم لوگوں سے پہلے دونوں ہی جہانوں (یعنی انسانوں اور جنوں) میں کسی نے بھی کیا اور وہ یہ ہے کہ تم لوگ اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کیلئے عورتوں کی بجائے مردوں کو استعمال کرتے ہو، تم لوگ تو بالکل ہی حد سے گزر گئے ہو'' (8)

لوط قوم نے خود اپنی بربادی کا سامان کیا اور آج کا انسان جو کہ پڑھا لکھا باشعور ہے پھر بھی وہ ان باتوں کو ہدایت کی طرف لے جانے کی بجائے خود کو گمراہی کے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تباہی اس کا مقدر ہوگی مگر پھر بھی اس راستے کو اپنے لیے چن لیتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ اپنی خاندانی تباہی کا بھی باعث بنتا ہے۔ مصنف نے بھی ناول میں ایسی حرکات کا ذکر کیا ہے یقیناً اس موضوع پر لکھنا بہت ہی مشکل ہوگا۔ مگر معاشرے میں پنپ رہے اس گناہ کو ناطق نے بہت ہی عمدگی سے کہانی کے ذریعے قارئین کی نذر کیا ہے۔ ''جلال دین'' اس کہانی میں کمپوڈر کا کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ پہلے بھی غلط کاموں میں ملوث ہے اور اسے کوئی گاؤں سے نکال نا پائے، اس صورت حال سے بچنے کیلئے اس نے لوگوں کو بہت ادھار دے رکھا ہے۔ وہ ڈسپنسری کی دوائیوں کو بیچ دیتا ہے، ان سے ملنے والی رقم کو لوگوں میں ادھار کی صورت میں دے کر ایک طرح سے ان کو اپنا غلام بنالیتا ہے اور اپنی حرکات پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔ مصنف نے ڈسپنسری میں ہی اس کی رہائش بتائی ہیاور ضامن جو کہ مرکزی کردار ہے وہ ڈسپنسری میں امرود کے درخت پر چڑھا امرود توڑنے کی غرض سے اور دیکھتا ہے:

''شمیر چارپائی پر الٹا لیٹا ہوا تھا اور یہ ننگا تھا۔ اس کے ساتھ جلال دین

بھی محض نکر پہنے ننگا لیٹا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے تھے۔''(9)

ضامن کیونکہ ابھی دس سال کا بچہ تھا وہ یہ سارا ماجرا سمجھ نہیں پایا اور اسے لگا کے شمیر جلال دین اس کو گلا دبا کر مار ڈالے گا۔مصنف نے ایک ایسا معاشرہ جہاں سادہ لوگ رہتے ہیں۔گاؤں جہاں ہر کوئی ایک دوسرے کو کسی نہ کسی ربط سے جانتا ہے اس کی عکاسی کی ہے کہ ایک ایسے ماحول میں بھی جہاں سب ہر معاملے میں ساتھ ہوتے ہیں۔وہاں بھی ایسی پس ماندگی نے جنم لے رکھا ہے ایسے ہی معاشرے میں لوگ شرافت کا لبادہ اوڑھے نا صرف خود کو بلکہ دوسروں کو بھی تباہی کے راستے پر لے جاتے ہیں۔

یہ لوگ جانتے ہیں ان کے پاس عبرت کے واقعات بھی موجود ہیں کہ قوم لوط کی بستیوں کو جہاں وہ رہتے تھے رہتی دنیا تک اللہ تعالی نے انتہائی بدبودار اور سیاہ جھیل میں بدل دیا جس سے کبھی بھی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا قرآن پاک میں بھی ان لوگوں کے لئے جا بجا اللہ تعالی نے نشانیاں چھوڑی ہیں لیکن جو لوگ گمراہی کو اپنا مقدر بنا لیتے ہیں وہ ان ہدایت کی نشانیوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔چالیس ایسے مقامات ہیں قرآن پاک میں جہاں حضرت لوطؑ کا ذکر آیا ہے۔پھر بھی یہ مقدر کے مارے لوگ ہدایت نہیں لیتے ہیں۔ناول نگار نے لوطی حرکات کو گاؤں میں رہنے والے سادہ لوگوں میں رہنے والے شیطان صفت انسانوں کا شیوہ بتایا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اپنی اس ہوس سے سادہ لوگوں کو بھی شکار بنا لیتے ہیں۔انسان جو کے خطا کا پتلا ہے بچپن سے جوانی تک اس سے خطائیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔مگر اللہ کی ذات پھر بھی اپنے بندے سے اس کی توبہ کی منتظر رہتی ہے لیکن جب کوئی توبہ سے انکار کرتا ہے تو تباہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

''جب کوئی قوم اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے غرور و تکبر اور عادات بد میں مبتلا ہو جائے ،تو ایسے لوگوں کے دل و دماغ پر شیطان قابض ہو جاتا ہے اور پھر یہ ابلیس کے نقش قدم پر چلنے لگتے ہیں''(10)

ناطق نے ناول میں جہاں پتھر تراش فیکٹری کا ذکر کیا ہے وہاں کا ماحول بھی کچھ ایسا ہی

دکھایا ہے۔ زیادہ تر کام کرنے والے افغانی لڑکے تھے۔ ضامن جب روزگار کے لئے اس فیکٹری میں جاتا ہے تو اسے فیکٹری ہی میں موجود افغانی لڑکوں کے ساتھ ان کے کمرے میں سونے کے لیے چارپائی دے دی جاتی ہے۔ جس پر ایک لڑکا اور سوتا تھا۔ اس سے پہلے مصنف نے ایک گاؤں کا ماحول دکھایا ہے جہاں ہم جنس پرستی عروج پر تھی۔

اب کہانی میں وہ ایک دوسری جگہ یعنی ایک فیکٹری کا ماحول دکھا رہے ہیں کہ اصل میں دور دراز سے کام کرنے کی غرض سے آنے والے لڑکوں کو جو ماحول میسر آتا ہے تو وہ اسی میں ڈھل جاتے ہیں اور پھر اسی کے رسیا ہو جاتے ہیں۔ کہانی کا کردار جس نے خود کو بچائے رکھا وہ یہاں اس ماحول سے بھی باعزت نکل جانے میں کامیاب رہا۔ فیکٹریوں میں کام لینے کے دوران مزدوروں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ انھیں ہر برے طریقے سے ڈرا دھمکا کر کام کے بدلے ملنی والی اجرت میں اضافے سے روکا جاتا ہے اور پھر بھی اگر کوئی طاقت رکھتا ہے، بولنے کی یا احتجاج کی تو اسے فیکٹری میں ہی بننے والی ایک یونین جو پہلے اسے ڈرا دھمکا رہی تھی جنسی زیادتی یعنی ہوس پرستی کا شکار بناتی ہے۔ وہ ایسے ہی لڑکوں کا ذکر کہانی میں کرتے ہیں جو کام کی غرض سے فیکٹری میں ہی رہتے ہیں اور ہم جنس پرستی جیسے گناہ کو اپنی عادت بنا لیتے ہیں اور پھر ایسی دلدل میں پھنس جاتے ہیں جس سے وہ کبھی نکل نہیں پاتے۔ اپنے ساتھ ساتھ وہ دوسرے افراد کے لئے بھی گناہ کی فضا قائم کر دیتے ہیں۔

> ''یہ تمام افغانی لڑکے جو مجھ سے عمر میں تو کم تھے مگر جنسی تلذذ کے شیدا تھے۔ انھوں نے نہایت بیباکی سے اپنے کپڑے اتار دیے اور اس نیم تاریک، کالے اور سیم زدہ گیلے بدبودار کمرے میں ایک دوسرے کے ساتھ جفتی میں مصروف ہو گئے'' (11)

ناول نگار نے اخلاقی پس ماندگی کی نہایت گری ہوئی صورت کو عیاں کیا ہے کہ ایسے گندے ماحول میں جہاں سانس لینا مشکل تھا۔ وہاں کہانی کا مضبوط کردار خود کو بچا کر نکلتا رہا مگر جب اس کو ایسا ماحول میسر رہا تو وہ خود بھی اسی دلدل میں پھنس گیا اور ہم جنس پرستی کا شکار ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد ضامن کی تمام اخلاقی قدروں کو بھی زوال آ گیا اور وہ خود کو اس گناہ کے حوالے کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

ناطق اسی بات کو عیاں کرنا چاہتے ہیں کہ انسان مادیت پسند ہے وہ ترقی کے زینے چڑھتا ہے اس دوران وہ تمام معاشرتی واخلاقی پس ماندگیوں کو نظر انداز کرتا جاتا ہے۔ وہ دھوکہ دہی، خودغرضی، مفاد پرستی، ہوس، طمع گیری اور موقع پرستی جیسی برائیوں کو غلط نہیں سمجھتا اور بالآخر ان میں ڈوب جاتا ہے۔ انہوں نے اس اخلاقی پس ماندگی کے خلاف آواز بلند کی ہے اور کہانی کے ذریعے عام عوام کو شعور دیا ہے۔

وہ معاشرے میں رہنے والے مختلف مردوں کی زندگی کے احوال کو عیاں کر رہے ہیں اور قاری کے دھیان کو اور اس کے ذہن کو ماحول میں پلنے والے اس حیوان صفت انسان سے آگاہ کر رہے ہیں۔ جو خود کو اب جانوروں کے درجات سے بھی نیچے گرا چکا ہے۔ کہانی میں اس طرح الگ الگ ماحول میں لوطی حرکات بیان کرنے کے پیچھے مقصد جو وہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ''ضامن'' کہانی کا مضبوط کردار ان دونوں واقعات سے اپنا دامن بچا پایا اور نکل گیا لیکن جب مسلسل ماحول ایسا میسر ہو تو مضبوط سے مضبوط انسان بھی اس سے بچ نہیں پاتا ہے۔ یہ گناہ جس کا ارتکاب انسان اگر بچپن میں کرے تو بڑھاپے تک ساتھ رہتا ہے اور ضامن جو کہ بچپن میں واقعہ کو سمجھ نہ سکا جوانی میں جب اس کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تو وہ دلدل میں پھنس گیا۔ جب کام کے سلسلے میں ہی ''ضامن'' کو ایک کرائے کے مکان میں سکونت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ وہاں دو بہن بھائیوں کے ساتھ شراکت داری پہ ایک ہی فلیٹ میں کچھ شرائط کے بعد ''ضامن'' رہنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ضامن ان دونوں کے کام سے ناواقف تھا اس لیے اس نے فیصلہ لینے میں عار محسوس نہیں کی، مصنف نے ناول میں یہ قصہ یوں بیان کیا ہے:

> ''میری ٹانگوں اور سینے کے بیچ نرم انگلیوں کی سرسراہٹ نے میرے جسم کی آگ پر ایندھن رکھ دیا تھا۔ اس ایندھن میں دو چہروں کو زیتون، دو مساموں کے پسینے سے بہنے والی کستوری اور دو لعاب سے ٹپکنے والا شہد شامل ہو چکا تھا۔ یہ تمام ایندھن میرے جسم کی آگ میں پھینک دیا گیا'' (12)

یہاں ناول نگار اپنے اصل مقصد کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ ضامن کا مضبوط کردار بھی اس موڑ

پر آ کر خود کو اس گندگی سے بچا نہیں پایا۔ یہی بات جو وہ بتانے کی جسارت کر رہا ہے کہ ایسے افراد جوان عادات کا شکار ہو جاتے ہیں، اپنے ساتھ ساتھ وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو بھی اپنے گناہ میں شامل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے میں یہ برائی جڑ پکڑتی رہتی ہے۔

جہاد کے نام پر اغوا کا کاروبار

جہاد کے نام پر اغوا کا کاروبار ایک المیہ ہے ہمارے معاشرے میں بہت سی تنظیمیں جن کا وجود اب معاشرے میں موجود ہے اور ان کی بہتات کی وجہ سے اکثر دشمن سادہ لوگوں کی سادگی کا فائدہ اٹھاتے ہیں کوئی مذہب کا واسطہ دے کر بچوں کے کچے ذہن سیکھیلتا ہے، تو کوئی وطن کی محبت کا لالچ دل میں ڈال کر ورغلاتا ہے۔ غیرت کا سودا کرنے کا ہنر ایسی تنظیموں میں عروج پر پایا جاتا ہے۔ گاؤں میں آ کر ایسی تنظیمیں بچوں کو اپنے وطن کو خطرے میں بتا کر اور ان کے آباؤ اجداد کے قصے سنا کر ان کے ایمان کو ہتھیار بنا کر کہ تم لوگ مومن ہو کیسے چپ بیٹھے ہو اور ان کو ان کی مرضی سے یہاں سے ایک ایسی دنیا میں لے جایا جاتا ہے۔ جہاں گھر والوں کو وہ اپنی مرضی سے چھوڑ چلے جاتے ہیں اور وہاں انھیں اپنے غلط عزائم کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال کا ذکر اس نے بھی کہانی میں کیا ہے ایک ایسا گروہ جس نے گاؤں کے سکول میں آ کر کچھ ایسے ہی کہانی سنا کر بچوں کو جہاد کے نام پر اپنے ساتھ لے گئے۔ لکھتے ہیں:

> ''کہتے ہیں جس یاجوج ماجوج کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ قوم بڑی ظالم ہیاور اس نے ہماری دیواروں کو چاٹ کر توڑ دیا ہے۔ اگر انھیں نہ روکا گیا تو سب کو کھا جائیں گے۔ اس لیے اپنے آپ کو بچانے کیلئے نکلو'' (13)

یہاں مصنف نے ناول کو ایک نیا موڑ دیا۔ عدیلہ جو کہ عماد کی ماں ہے وہ اپنے بیٹے کی جدائی میں اس گروہ کے پیچھے لگ گئی اور سارا ماجرا سامنے آ گیا۔ یعنی یہ تنظیم جو کہ جہاد کے نام پر بچوں کو لے جاتی تھی ان کے دو ارادے اس نے بتائے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا خوبصورت ہے تو اس کے جسم کو فروش کیا جاتا اور اگر لڑکا خوبصورت نہیں ہوتا تو اسے کسی محاذ پر لڑنے کیلئے بھیج دیا جاتا۔ عدیلہ کو بیٹے کی جدائی نے

پاگل کر کے رکھ دیا۔اس نے ہتس نہیں ہاری اور سکول پہنچ گئی کہ کسی بھی طرح وہ عماد کو واپس لے آئے گی۔وہ اکیلے ہی نکل کھڑی ہوئی اور ارادہ ایسا مضبوط کہ آج وہ اپنے راستے میں آنے والی ہر دیوار کو گرا دے گی،مگر بیٹا ضرور واپس لے آئے گی۔وہ شیرنی کی طرح سکول پہنچی، ہیڈ ماسٹر کو گریبان سے جا پکڑا اور اپنے بیٹے کا مطالبہ کیا۔

ہیڈ ماسٹر کو عدیلہ سے ایسے رویے کی توقع نہ تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔آج سے پہلے تمام والدین خاموش ہو جاتے تھے۔ان کے بچے اپنی مرضی سے جہاد پہ نکل کھڑے ہوتے تھے اور جدائی میں تڑپ کر بالآخر خاموش ہو جاتے تھے لیکن عدیلہ کا یہ رویہ دیکھ کر ہیڈ ماسٹر بھی پریشان ہو گیا اور اس نے عدیلہ کی مدد کرنے کا ارادہ کیا۔اس نے دراصل کہانی میں یہ بات عیاں کی ہے کہ ایسے گروہ اسلحہ کے زور پر سب کو دبا لیتے ہیں اور ملک کے بڑے بڑے عہدے داران ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اس لیے ان کو روکا نہیں جاتا۔آپس میں مل بانٹ کر کھانے کیلئے اپنے سے نچلے طبقے کو ڈرا دھمکا کر کچھ لالچ کی ہوس والوں کو پیسہ دیکر اور کچھ کو بلیک میل کرا کے چپ کرا دیتے اور اپنے کام کو جاری رکھتے۔یہ معاشرے میں ایک ایسی پس ماندگی ہے جس کو بے نقاب کیا جانا نہایت ضروری ہے۔مصنف نے ناول کے ذریعے باور کرایا ہے کہ اصل میں انسان کو اپنے حق کو حاصل کرنے کیلئے اپنے ضمیر کی آواز کے علاوہ سہاروں پہ نہیں رہنا چاہیے اور اس طرح ہونے والے گناہوں کا پردہ فاش کرنا چاہیے۔عدیلہ جب ہیڈ ماسٹر کو کسی صورت جانے نہیں دے رہی تھی تب ہید ماسٹر نے بھی بالآخر خاموشی کو توڑا:

> ''اس حرامی عبدالنبی کو بلاؤ،خنزیر کا پتر مجھے بھی لے ڈوبا، ہیڈ ماسٹر ایک دم چیخا،بی بی تیرا پتر آجائے گا،صبر کر جا اب میں اسے منگواتا ہوں نوکری جاتی ہے تو جائے میں نے اسے کہا بھی تھا سکول کے بچوں سے باز آؤ لیکن یہ جہنمی پتا نہیں کہاں تک ڈبوئیگا۔اس لوطی پہ خدا کی پھٹکار''(14)

واقعہ کچھ یوں ہوا کہ گاؤں کے مدرسے کا قاری جو کہ اس کام میں ملوث تھا وہ عرب لوگوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔مصنف نے کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی ملک میں غلط ارادے

سے تب تک نہیں داخل ہوتا جب تک ملک ہی سے غدار ساتھ مل کر انھیں داخل ہونے کا موقع نہ دیں۔قاری نے اپنے گاؤں کے تمام راز اس تنظیم کو دیر کھے تھے۔گاؤں کے ایک ایک لڑکے کو اس کا پتہ تھا جیسے ہی وہ بڑے ہوتے عین جوانی میں پہنچیم ویسے ہی مدرسہ میں عرب لوگوں کو بھلا کر انھیں جہاد کے نام پر دوسرے ممالک میں فروخت کر دیتا۔ایسے لوگ اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں اور جہاد کے نام پر اچھا خاصہ پیسہ بٹور لیتے ہیں۔اس بات پر کاروائی کیلئے جب عدیلہ نے کہا کہ وہ شکایت کرے گی مدد لے گی تو اس پر ہیڈ ماسٹر نے سمجھایا کہ تمہارا یہ انتہائی قدم تمہارے بیٹے کی جان بھی گنوا سکتا ہے۔یہ لوگ سب ملے ہوتے ہیں اس لیے تمہارا کسی کو بھی مدد کیلئے کہنا بیکار ہوگا۔خاموش ہو جاؤ تمہارا بیٹا ایسے ہی مل سکتا ہے۔شور مچانے پر تمہیں صرف خسارا ہوگا۔ناطق نے کہانی میں لوگوں کو مجبور دکھایا ہے کہ مجبور انسان اپنے ہی مرنے کی دعا کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔اس نے ماجرا کچھ یوں بیان کیا ہے کہ:

> ''جب مدرسے اور سکولوں کے لڑکے ٹریننگ کیلئے تیار ہو جاتے ہیں تو بہت سے جس مقصد کیلئے منتخب ہوتے ہیں اسی کام پر بھیج دیے جاتے ہیں۔کچھ لڑکے جو منہ متھے کے ٹھیک ہوتے ہیں انھیں عربوں سے پیسے لے کر بیچ دیتے ہیں پھر وہ چاہے جو بھی کام لیں۔یہ جو تم مدرسے میں عرب لوگوں کو دیکھ رہی تھی،اسی خاطر یہاں آئے تھے یہ کاروبار سرکار کے کچھ بڑے اور یہ مولوی آپس میں مل کر چلاتے ہیں''(15)

مدرسوں کے حالات کو ناطق نے کہانی میں بتایا ہے کہ لوگ دین کی تعلیم دینے کے نام پر بچوں کو باغی ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ان کے روابط ہوتے ہیں۔باہر کے ملکوں میں جہاں پر انھیں رضا کاروں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ یہاں یعنی پاکستان میں مختلف مدرسوں میں اپنے ساتھی سے رابطہ کر کے اسے اس کام کا بھاری معاوضہ دے کر ایسے گندے جرم کیلئے تیار کرتے ہیں اور پیسے کا لالچ ایسا ہے کہ جب اتنی بھاری رقم ایک ساتھ ملتی ہے تو آنکھیں ویسے ہی بند ہو جاتی ہیں۔عدیلہ کو یہ گلہ تھا ہیڈ ماسٹر سے کہ اگر اسے اس بات کا سب پتہ تھا تو وہ خاموش کیوں رہا۔اس پر قاری نے کہا کہ وہ خود بھی بچوں کا

باپ ہے اس لیے اس کو خاموش رہنا پڑا۔اسی وجہ سے آج کے باشعور والدین بھی اپنے بچوں کو دین کی تعلیم کیلئے مدرسوں میں نہیں بھیجتے بلکہ وہ یہ کام بھی گھر میں ہی کرتے ہیں۔ناول میں ناطق نے ہر پہلو کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ایک ایک بات کو بے پردہ کیا ہے:

> ''ہمارے ملک کے ایک بڑے ادارے کو لڑاکا قسم کے رضا کار چاہئیں۔اسے یہ مولوی رضا کار مہیا کرنے کا کام کرتے ہیں۔ملک اور ملک سے باہر نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کو بھیجتے ہیں اور اس کے عوض ان کے مدرسے چلتے ہیں۔بڑی گاڑیاں ان کے ہاں آنے لگی ہیں''(16)

سلسلہ یہاں ہی ختم نہیں ہوا اپنے آپ کو بچانے کیلئے مولوی عبدالحئ نے پھر عدیلہ کو بھی بلیک میل کرنا شروع کر دیا کہ وہ اپنے بیٹے کے بدلے بیٹی کا رشتہ اس کے ساتھ طے کرے۔ناول نگار نے معاشرے کی اس برائی کو مکمل طور پر کھل کر اس کی ہر پرت کو تہہ در تہہ قاری پر عیاں کیا ناول ذریعہ ہے معاشرے کی عکاسی کا اور ناول نگار نے انصاف سے کام لیا ہے۔

جائیداد کا تنازعہ نسل در نسل دشمنی

ناول نگار نے کہانی میں تین بھائیوں کا ذکر کیا ہے جو کہ ضلع خانیوال کے گاؤں ٹبہ والی میں رہتے تھے۔صادق بخش،اللہ بخش،احمد بخش تینوں بھائیوں کے پاس زمین جائیداد بتائی گئی ہے احمد بخش جو کہ ان سب سے بڑا ہے اس کا ایک بیٹا ہے۔طلال احمد،دوسرے بھائی کی ایک بیٹی ہے بیٹی کی پیدائش پر بیوی کا انتقال ہو گیا اور تیسرے بھائی کی دو بیویاں ہیں مگر اولاد کوئی نہیں۔ان تینوں بھائیوں کا باپ جنگ عظیم دوم میں انگریزوں کے خلاف جنگ کرتا ہوا اپنے ایک بازو سے ہاتھ دھو بیٹھا اس صورت میں اسے حکومت کی طرف سے زمین الاٹ کی گئی،کچھ بعد میں یہ بھائی اپنے دماغ سے اضافہ کرتے گئے۔تینوں بظاہر بہت اچھے بھائی تھے۔مگر طلال احمد جو کہ دل میں بغض رکھتا تھا،وہ اور اس کا باپ احمد بخش تین ہزار ایکڑ کے امور خود سے ہی دیکھتے تھے۔سب کام بہت خوش اسلوبی سے ہو رہے تھے۔تینوں بھائیوں میں بگاڑ تب پیدا ہوا جب دوسرا بھائی اپنی زندگی میں ہی اپنے حصے کی زمین اپنی

بیویوں کے نام کر دینا چاہتا تھا۔ناطق نے بھائیوں کے پیار میں بھی بتایا ہے کہ خون کے رشتے ، سگے بھائی بھی کس طرح جائیداد کے لالچ میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔صادق بخش ہمیشہ سے چاہتا تھا اور اس سلسلے میں اپنے بڑے بھائی احمد بخش کو بہت بار کہہ چکا تھا کہ وہ اپنا حصہ اپنی بیویوں کے نام کرنا چاہتا ہے اور احمد بخش ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیتا تھا۔دونوں میں بہت تکرار ہوگئی اور بات طے پائی کہ وہ اس سال کپاس کی کاشت پر رقم دونوں بیویوں میں تقسیم کر دے گا۔اس تکرار کی وجہ سے اب بھائی ساتھ میں کم بیٹھتے تھے۔مگر احمد بخش نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا صادق بخش اب تمام معاملے کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا اس لیے اس نے خود ہی عدالت جا کر اپنی کاروائی کو پورا کرنے کی کوشش کی مگر ان کے ساتھ واپسی پر حادثہ پیش آ گیا۔

> ''آج صبح صادق بخش ان سب چیزوں کا اہتمام کر کے گیا تھا مگر کچہری میں کمشنر کی آمد کے سبب تمام عملہ دفتری کام چھوڑ کر اس کے پروٹوکول کیلئے جمع ہو گیا اور صادق کا کام آج بھی نہ ہو سکا۔اسے کل پر ٹال دیا گیا۔واپسی پر صادق بخش کی جیپ ایک میل ستون سے ٹکرا کر الٹ گئی اور ایک گہرے کھڈے میں جا گری۔تینوں بھائیوں کے سروں اور جسم کے دوسرے حصوں پر گہری چوٹیں آئیں''(17)

تینوں کا انتقال ایک حادثے کی صورت میں ہو گیا خون کا سفید ہونا کی اس سے بہتر مثال کوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔جس طرح ناطق نے ناول میں سگے بھائیوں میں جائیداد کے تنازعہ پر پیش کی ہے۔دوسری طرف دوسرا بھائی جس کی ایک بیٹی ہے اس نے اپنی بیٹی کو ان سب سے دور کراچی بھیج رکھا تھا اس نے دیکھا کہ جنازے پر سب پولیس والے تھے۔ایس پی اس کے علاوہ اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہیں الہ بخش نہیں جانتا تھا۔آس پاس کے گاؤں کے سیاسی آدمی تک بھی آئے ہوئے تھے۔

یہ لوگ کب ، کیسے اور کس طرح واقف بنے کوئی نہیں جانتا تھا۔اس بات کا الہ بخش نے جائے حادثہ پر پہنچ کر جائزہ لیا کہ اس کے مطابق تو بھائی کا ملیدہ بن جانا چاہیے تھا مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔وہ عجیب دماغی کیفیت میں تھا جس کا وہ سامنا کر رہا تھا۔مصنف نے حالات کی سنگینی کو اس طرح بیان کیا

ہے کہ ایک کے بعد ایک بات خود بخود سامنے آتی چلی گئی۔ بالکل اس طرح جس طرح جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور سچ چھپائے نہیں چھپتا۔

ناطق نے ایک اور سنگدلی کا واقعہ پیش کیا ہے کہ جب اللہ بخش پہ تمام راز کھلنے لگے تو یہ بات سامنے آئی کہ صادق بخش مرنے سے پہلے فرد نامہ دے کر گیا تھا کہ اس کی ساری جائیداد طلال کے نام یعنی اس کے بڑے بیٹے کے نام کر دی تھی۔ پھر تو واقعی معاملہ سارا سمجھ میں آ گیا کہ اگر ایسا تھا تو وہ دونوں بیویوں کے نام پر زمین کرنے کی ضد کیوں کرتا تھا۔

پہلے معاملے کی صورت حال کو سمجھتے ہوئے اللہ بخش نے اپنی بیوی بیٹی کو اپنے بعد اپنی زمین جائیداد کا نام ہبہ کرنے کی ہدایات جاری کیں پھر اپنے بھائی کی جائے حادثہ اور اس کی موت کی تفتیش کیلئے دوبارہ درخواست دے دی۔ اس معاملے سے آگ اور بھڑک اٹھی ناول نگار نے معاملے میں ہونے والے ایک ایک جز کی تفصیل بہت گہرائی میں جا کر بیان کی ہے۔ احمد بخش نے اپنے بھائی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بات کو عدالت میں جانے سے نہ روک پایا۔ دوسری طرف طلال اپنے اس چچا کو بھی موت کی نیند سلانے کی تیاری کر چکا تھا:

> ''یہ کارتوس اتنا سخت اور زوردار تھا کہ ایک بھینسے کو مارنے کیلئے کافی تھا۔ اس نے اللہ بخش کے دل کے اوپر رکھ کر گھوڑا دبا دیا۔ ایک ایسا دھماکا ہوا کہ تمام عدالت کانپ اٹھی'' (18)

جس طرح مصنف نے ماحول کا نقشہ کھینچا ہے، ایک دہشت زدہ خوف کی لہر دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ قاری بھونچکا سا رہ جاتا ہے کہ یہ جائیداد کیا انسان کے بس میں ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور اسے اپنے لیے تمغہ سمجھتا رہے گا یا پھر وہ مرنے کے بعد اس جائیداد کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ دونوں ہی صورتیں ناممکن ہیں پھر سگے رشتے خون کی ندیاں بہاتے چلے گئے اور قاری کے دل و دماغ پر سوچ کا ایک بوجھ مسلسل چھوڑ گئے۔ ناطق بذات خود ایک تاریخی کہانی لکھنے میں صف اول کے ادیب مانے جاتے ہیں اور یقیناً انھوں نے نسل در نسل دشمنی کا وہ نقشہ کھینچا ہے جو ایک خوفناک اور ناقابل برداشت واقعہ محسوس ہو رہا ہے۔

جائیداد کے اس تنازعے نے بس یہاں تک ہی دم نہیں لیا بلکہ اس سانپ کا منہ کھلا ہی رہا گاوں بھر میں یہ لوگ مشہور ہو گئے کہ جائیداد کی خاطر انہوں نے اپنے سگے بھائیوں کا قتل کر دیا ہے اور ہوس بڑھتی ہی گئی طلال نے آگے بھی زمین کے لالچ میں اس قتل وغارت کو جاری رکھا کہ اس سے کوئی تنکا برابر بھی زمین یا جائیداد میں سے کوئی حصہ نہ لے سکے۔ بات جب تک بھائیوں میں چھپی ہوئی تھی پر طلال تو ایسے نکل کر سامنے آیا کہ جیسے وہ کسی کو زندہ سامنے نہیں دیکھ سکتا۔

اس نے خاندان کی تمام عورتوں کو بھی جائیداد سے محروم رکھا ناطق کے مطابق یہ پاکستان میں ہی ایسا ہے جہاں عورتوں کو ان کے حق سے دستبردار کر دیا جاتا ہے۔ قانون ہر طرح کا موجود ہے مگر بات یہ ہے کہ اس پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ یہ صورت حال صرف گاؤں میں نہیں پائی جاتی بلکہ شہروں میں جائیداد کی خاطر ایسے مسائل نظر آتے ہیں۔ قانون مرد اور عورت کے وراثتی حقوق کا تحفظ کرتا ہے مگر یہ آگے سے افراد ہیں جو قانون کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور یہ وہ لہو تھا جو طلال کے منہ کو لگ چکا تھا پھر اس نے نسل در نسل اس کو ہوا دی اور سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا۔ ناطق نے طلال کی پھیلائی ہوئی تباہی کا قصہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ''اسی طرح چودھری طلال نے اللہ بخش کو مار دیا، صادق بخش کو مار دیا۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ سگے پپو کو بھی اس نے قتل کیا ہے۔ اللہ بخشے پہلے قتل تو بھائی کا خود اسی احمد بخش نے کروایا تھا خیر اپنی سگی پھوپھی کو مار دیا، پھوپھی زاد کو بھی قتل کرا دیا۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ہی اپنی بہن کو زہر دے دیا اور کہہ دیا اسے محرقہ ہو گیا تھا۔ اس زمین کے بدلے میں اس نے کیکو کا ایک فرد نہیں چھوڑا۔ جب تک اس کا باپ حیات تھا پھوپھی بچی ہوئی تھی اس کے مرنے کے بعد اللہ جانے کس نے سبق پڑھایا ایک دن صبح ہوئی تو رعایا کو پتہ چلا پھوپھی زہراں کا دل بند ہو گیا اور وہ مر گئی۔ سب رعایا کو پتہ تھا، چوہدری طلال نے اس کا گلا گھونٹا ہے پر چلتی توپ کا منہ کس نے دیکھا ہے''(19)

ناطق نے جائیداد کے تنازع میں قتل وغارت کا جو قصہ کہانی میں بیان کیا ہے۔وہ دراصل اس معاشرے میں عورتوں کو ان کے حق سے محروم کر دینے والوں اور پھر ان کو موت کے گھاٹ اتار دینے والوں کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔سماجی رویوں کی اس سے بہتر غمازی نہیں ہوسکتی۔وہ اس قدر کرب سے قاری کو گزارتے ہیں اور زمانی تقاضوں اور عصری رویوں کے مطابق وہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے افکار وجذبات میں پرسوز سماجی کرب کی ایک گونج سنائی دیتی ہے۔نثر میں ایسی جدت انیں ق دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے اور یہ تخلیقی جہت انھیں مزید اس طرح کے حالات وواقعات کو بے نقاب کرنے کی طرف گامزن رکھتی ہے۔وہ نہ تو ظلم ہوتا دیکھ کر چپ رہ سکتے ہیں اور نہ ہی مادیت پرستی کے اس دور میں وہ خاموشی کو اپنا شعار بنا سکتے ہیں۔

کرپشن،نجی مفادات اور غداری

ہر وہ شخص غدار ہے جو اپنے ذاتی مفاد کیلئے پھر غیر آئینی طریقے سے پاکستان کے آئین کو منسوخ کر دے یا پھر کسی بھی قسم کی کرپشن جو ملک کیلئے بدنامی کا باعث بنے ،خطرہ بنے ،کسی آئین کو معطل کرے، یا کسی بھی سازش میں بھی شامل ہو تو وہ ملک کا غدار ہے۔یہ ایک ایسی لعنت ہے جو کسی بھی ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔

یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں یہ ہمارے لیے ہماری ماں جیسی ہے پاک زمین کی گود میں پرورش پا کر پھر اسی سے غداری کرنا،ایسے حالات میں جہاں غدار موجود تھے وہاں وطن پر مرمٹنے والے بھی موجود تھے مگر جو نقصان وطن کو ان غداروں سے ہوا وہ ملک کیلئے شرمندگی کا باعث بنتا رہا۔وطن سے بغاوت کرنے والے کچھ لوگوں نے وطن اور دین کی پرواہ نہ کی اور صرف چند پیسوں کی خاطر اپنا ایمان بیچ ڈالا اور جہاں ان کو وطن کی حفاظت کیلئے کھڑے ہونا تھا وہ وطن کے غداروں کی صف میں شامل نظر آئے۔اکثر اوقات ہم غداروں کو پکڑ پانے میں اتنی دیر کر دیتے ہیں جب تک وہ ہماری بنیادوں کو کھوکھلا کر چکے ہوتے ہیں۔

ناطق نے بھی ناول میں ایسے ہی ایک واقعے کو بیان کیا ہے کہ جب ''ضامن'' کہانی کا مضبوط کردار وزارت خارجہ کے دفتر میں چودھویں سکیل کے کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگا تو اس

کے ساتھ کچھ ایسے حالات پیش آئے جن سے وہ لاعلم رہا کے کہیں نہ کہیں اسے ملک کے خلاف کام کرنے کی سازش میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔ یقیناً اس پر قلم اٹھانا مصنف کیلئے بہت بہادری کا کام ہے۔ آج سے پہلے بھی اردو ناولوں میں ملکی حالات پر بات کی جا چکی ہے اس لیے ناول نگار کی اس تخلیقی کاوش میں وطن سے محبت کا جذبہ بھی چھپا نظر آتا ہے۔ جس کا ثبوت انھوں نے اپنے فن کو تخلیق کر کے دیا ہے۔

ضامن کو جب کام سکھایا گیا تب وہ لاعلم تھا کیونکہ اسے کام کرنا تھا مگر اسے بات معیوب بھی لگتی کے آنکھ، منہ اور کان بند کر کے کام کرنا ہے۔ اسے جب اصول سمجھائے گئے کرا کی کے یہ جملے اس کیلئے نہایت بھدے تھے کہ اس کو اپنی قبر سمجھو دفتر کی کوئی بات گیٹ سے باہر نہ جائے۔ سمجھو کہ تمہیں اسی میں دفن کر دیا گیا ہے۔ ناول نگار نے یہاں پہ ہی کام کے خفیہ رکھے جانے کی نشاندہی کر دی ہے کہ معاملہ کچھ ٹھیک نہیں ہے:

> ''اپنے افسر کے کام پر اعتراض مت کرو چاہے وہ ملک کا سودا ہی کر رہا ہو۔ یاد رکھو صاحب کو سزا کبھی نہیں ہو سکتی اور سبار ڈی نیٹ کبھی بچ نہیں سکتا۔ افسر کے کسی کام کی ٹوہ میں نہ لگنا، ورنہ نوکری سے فارغ یا تمام عمر کرپشن کے الزام میں جیل جاؤ گے''(20)

ناول نگار نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملک میں غداری کرنے والے اپنے نیچے کام کرنے والوں کو بالکل اسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے وہ صرف ان کے نوکر ہیں۔ ان سے وہ ہر طرح کا کام لے سکتے ہیں، ان کے سامنے کسی بات کو کھلنے بھی نہیں دیتے کہ یہ کام کرنے کی وجہ کیا ہے، کونسی فائل کس کام میں استعمال ہوتی ہے، ان سب باتوں کو راز رکھا جاتا ہے اور خود اپنے غلام پر کام کروانے کیلئے بھی کسی کو تعینات کیا جاتا ہے کہ اس پر بھی نظر رکھی جا سکے تا کہ کوئی فائل آگے پیچھے نہ ہو اور نہ ہی اسے پڑھنے کی کوشش کی جا سکے۔ ضامن خاموشی سے یہ کام کرتا رہا اسے جس کام کو کرنے کیلئے کہا گیا وہ کرتا رہا جس طرح اس سے کام لیا جاتا رہا خود اسے بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ فائل کے اندر ایک تاریک کمرا جس میں وہ فائلوں کی ردو بدل کرتا رہتا اور دنیا سے دور صرف ایک کمرے کی زندگی میں ہی اپنی زندگی کے رات و دن ایک ایسے کام کیلئے بسر کرتا ہوا جس کا اسے بھی اندازہ نہ تھا۔ جب اسے سمجھایا جا رہا تھا کہ کیسے

کام کرنا ہے اس پہ تعینات کیے گئے پہلے سے موجود آدمی کا کام صرف یہی تھا کہ اس کو وقتاً فوقتاً بس یہی بتاتا رہے کہ اسے بس اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔اس نے کھید لفظوں میں ضامن کو سمجھایا کہ تم سمجھ رہے ہو گے کہ یہ آفس گورنمنٹ کا ہے اس آفس کا تمام سرمایہ بھی گورنمنٹ کا ہے، ملک کا ہے، کتابوں اور سیشن کورٹ میں یہی لکھا ہے مگر پھر بھی تمہیں صرف اپنے ملک کیلئے کام کرنا ہے ملک کیلئے نہیں اگر وہ تمہیں ایسا کرنے کو کہے کہ اس آفس کی اینٹیں میرے گھر میں لگا دو تو ایسا کرنے میں پل بھر بھی دیر نہ کرنا۔ناول میں اس سچائی کی عکاسی کی گئی ہے کہ غدار کس حد تک مفاد پرست ہو سکتا ہے۔ناطق لکھتے ہیں:

> ''محب وطن بننے کی سیڑھی ہمیشہ غداری کے کنویں میں اترتی ہے۔ہم یہاں گورنمنٹ کی نوکری کرنے نہیں آئے، اپنے باس کی نوکری کرنے آئے ہیں جسے گورنمنٹ کہتے ہیں وہ یہاں کا فقط باس ہوتا ہے''(21)

ناول کیونکہ طویل ہوتا ہے اس لیے اس کی کوکھ میں مختلف عوامل سما سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ واقعات، خیالات، جذبات اور ثقافت کو اس میں حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ناول نویس، یعنی ناول لکھنے والا، اپنی ذاتی خواہش کے مطابق کوئی نئی دنیا نہیں بناتا وہ ہماری دنیا سے ہی بحث کرتا ہے۔وہ لاشعور میں چھپے ہوئے جذبات و احساسات کو شعور میں لے کر آتا ہے اور معاشرے کے مطابق قاری کے ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ناول نگار نے وطن کیلئے جو چیز محسوس کی کہ کس طرح ہمارے اندر سے ہی غدار ہمارے ملک کو ترقی کے زینے چڑھنے نہیں دیتے۔

ناطق نے تمام واقعات کو ناول کے ذریعے ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔فائلوں کے کام میں ضامن کو جو سمجھ آئی وہ یہ تھی کہ صاحب لوگ جن کو اوپر لے کر آنا چاہتے تھے۔اس کی فائلوں کو آسان محکموں میں بھرتی کروا کر ڈیوٹیشن پر لے لیتے ہیں اور سرکاری لوگ ایک دوسرے کو ابلائج کرتے ہیں اس لیے وہ ایک محکمے سے دوسرے محکمے میں بھرتی کروانا آسان سمجھتے تھے۔مشکل مرحلہ بس یہی ہوتا ہے کہ شروع میں اپنے عزیز کو چھوٹی جگہ پر رکھنا پھر وہی اوپر آنے میں دن نہیں لگاتا اور ان کی ڈگری بھی اعلی نکل آتی ہے۔اگر کوئی اعتراض بھی کرتا ہے تو قانون کی شقیں تو ختم کسی صورت نہیں ہوتی کیونکہ بالکل

اور یجنل کام ہوتا ہے۔اعتراض کرے گا بھی تو کون کرے گا، وہ جو جھونپڑی میں رہتا ہے، جس کی آواز دبا دی جاتی ہے۔کوئی بھی ان باریکوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ان باریکیوں کو جاننے کیلئے پراسرار گلیوں سے گزرنا پڑتا ہیاور ممکن حد تک ان ہی باریک گلیوں میں اس کے وہم دور کر دیے جاتے ہیں۔کسی کو بھی ان دفاتر تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ناطق نے ناول میں عام آدمی کے خیالات کو ہر وقت پیش نظر رکھا ہے:

''میاں جن کے حق یہ لوگ کھاتے ہیں ان دفتروں تک نہ آگہی ہے نہ رسائی ہے اور نہ وہ اس دنیا سے واقف ہے انھیں یہ خبر نہیں کہ اسلام آباد کے فلاں کمرے میں فلاں فائل کے پیچ پر اس کا معاشی اور سماجی قتل ہو چکا ہے یا اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اسے بالکل اطلاع نہیں''(22)

ناول نگار نے اس دنیا کو پس پشت ڈال کر تخیل سے تخلیق کا کام لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ لوگ اس بات کے سحر سے نکلیں کہ زندگی میں انھیں ہمیشہ سادہ اور اصولوں کے مطابق ہی زندگی گزار دینی ہے۔ایسے دفاتر اگر کسی کام میں دلچسپی رکھتے ہیں تو صرف اس میں ،ان کو ذاتی مفاد کتنا مل رہا ہے، کیسے مل سکتا ہے اور اس کا تحفظ کیسے ممکن ہے۔

وہ ایسا پلاٹ بناتے ہیں جس میں بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا اور ان کے پلاٹ میں ان کا فن اور حسن بخوبی نظر آرہا ہوتا ہے۔ناول نگار نے ایمبیسڈرز کا ذکر کیا ہے کہ ان کیلئے پارٹیوں کا اہتمام کیا جاتا ہیاعلیٰ عہدے داران کے گھروں میں جوان کیلئے مفید ہوتی ہے اور نئی نئی راہیں ملتی ہیں۔انھیں کس طرح اگلا قدم اٹھانا ہے اپنی فیملیز کیلئے ویزے اور فلاں نیشنیلیٹیز ملنا ان کیلئے بائیں ہاتھ کا کام ہو جاتا ہے۔اسی طرح ان کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں اور نسل در نسل سیاست سے جڑے رہتے ہیں اس نیا یک اور حقیقت جو عیاں کی وہ تھی جب ضامن کو کام کی جگہ بدل کر سیدھا کوٹھی میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے تب کہیں جا کر ضامن کو سمجھ آتی ہے کہ اصل میں اس سے کیا کام لیا جا رہا تھا۔

''صاحب نے اپنے گھر میں اپنے ایک خاص کمرے میں ایک مشین نصب کر رکھی تھی۔جس پر ایک فائل کی خوبخو کئی فائلیں نقل تیار ہوتی

تھیں۔میرا کام ان کی نقلیں تیار کرنا ہوتا تھا‘‘(23)

اگر ناول کا کام کہانی کو غیر ضروری طوالت دینا واقعات کا تانا بانا بننا، تھوڑی بہت منظر نگاری اور جذباتی مکالمے لکھنا ہی ہوتو اردو ناول بھرے پڑے ہیں۔بات تو تب ہے جب مقصدیت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور اس سلسلے میں اس کا فن مقصدیت کے تمام پہلوؤں کو پورا کرنا ہے۔عام آدمی کو تمام باتوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن کو وہ اعلیٰ مقام بخشتے ہیں جن سے اس میں خود نکھار پیدا ہوتا ہیاور قاری اپنے سمجھنے کی حس کو پہلے سے زیادہ تیز محسوس کرنے لگتا ہے۔جیسے ناول نگار نے ان خطوط کا ذکر کیا ہے کہ اپنے نجی مفادات پر ملک کو تباہی کے راستے پر ڈالا جارہا تھا۔وہ خطوط جو واضح کررہے تھیکہ وہ تمام کام جنھیں ہمارے سیاستدان اور حکمران کرنا چاہتے تھے۔انھیں بیوروکریسی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مل کر سبا تاڑ کررہی تھی۔مصنف نے بہت تیکھے انداز میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ہمارا ایڈمنسٹریشن سسٹم کس طرح سے سادہ لوگوں کی سادگی کا فائدہ اٹھاتا ہے۔یعنی ہمارے ایڈمنسٹریٹولوگ کسی بڑے منافع کے نہیں بلکہ معمولی اور بعض اوقات بغیر کسی نفع کے ہی صرف اگلے کو خوش کرنے کیلیئے ہی ملک سے غداری کی اتنی بڑی ذمہ داری کو اپنے کندھوں کا بوجھ بنا لیتے ہیں۔ملک سے غداری کا یہ بوجھ وہ بھی محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کا سارا وزن عوام کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے اور عام انسان کی زندگی تماشہ بن کر رہ جاتی ہے۔ملک سے غداری پر وہ لکھتے ہیں:

’’یہ بہت حساس خطوط تھے جنھیں صرف وزیر اعظم اور ان کی خاص کابینہ تک محدود ہونا چاہیے تھا مگر ان کی نقلیں تیار ہو کر کہاں جارہی تھیں‘‘(24)

ناول نگار نہ صرف حقیقت کے نزدیک واقعات بیان کرتا ہے بلکہ انھیں کہانی کی شکل دے کر دلچسپ بنا دیتا ہے۔بہت خوبصورتی سے کرپشن کی تمام کہانی کو بیان کیا اور پھر ضامن نے اس پر احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ ملک کے ساتھ غداری نہیں کرے گا تو اسے حبس بے جا میں ڈال دیا گیا یعنی یہ کام کرنے والے ہر طرح کیھنر سے واقف ہوتے ہیں۔ناطق کہانی بیان کرتے ہوئے اسے حقیقت کا رنگ دینے کیلیئے علم کی پیاس بجھانے کی غرض سیسر حدیں تک عبور کرجاتا ہے۔ایک ایسی

حقیقت کو اجاگر کیا ہے، سارا معاشرہ جس تکلیف کو برداشت کر رہا ہے اس سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں کہ آخر وجہ کیا ہے اور کیوں ہے؟

پروڈکشن ہاؤس کے نام پر جنسی استحصال

یہ ناول نگار کا مشاہدہ، تخلیق اور تحقیق ہے جو انھیں دوسروں سے نمایاں کرتی ہے۔ وہ بے باکی سے اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔ ناول نگار نے ظفر عالم کا ذکر کیا ہے کہانی میں جو کہ پروڈکشن ہاؤس چلاتے ہیں اور ان کی بیگم وہاں پہ ٹیچر ہیں۔ وہ لڑکیوں کو پروڈکشن کے کام سکھاتی ہیں۔ ضامن کی جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ اسی کشمکش میں تھا کہ وہ ضامن سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ پہلے ہی اس کے دل و دماغ میں ذیشان اور شیزہ کے حوالے سے سوالات کے انبار تھے۔ ضامن نے ظفر عالم سے ملاقات کے بعد اس کے نتائج بھی کچھ یوں نکالے:

> ''مجھے یہ شخص پورے سسٹم کا مرکزی کردار معلوم ہو رہا تھا اور اس کی بیوی جسے وہ ٹیچر بتا رہا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا یہ شوبز ڈیزائننگ انڈسٹری دوسرے لفظوں میں سیکس انڈسٹری ہوتی ہے'' (25)

یہ ایک معمہ تھا۔ ضامن کیلئے وہ الجھتا جا رہا تھا۔ ناول نگار کی تحریر شعور زیست کے ساتھ ساتھ شعار زیست بھی دیتی ہے جو قاری میں ترفع پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ بہر حال قاری کے دل و دماغ کو شعور تب ملنا شروع ہوا جب ضامن، ذیشان اور شیزہ دونوں کے ساتھ ایک فلیٹ پر رہنے آ گیا۔ وہ ایک عجیب قسم کا فلیٹ تھا کبھی دوست آتے، بہت چہل ہوتی، کبھی بہت خاموشی، کبھی رقص کی محفل، کبھی انتہائی بیزاری محسوس ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر ضامن جو شیزہ کی محبت میں گرفتار ہو کر فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

ناول نگار نے بے پردگی کی ایک ایسی فضا قائم کی ہے جو قاری کو سوچوں میں گم چھوڑ دیتی ہے۔ وہ سوچتا رہتا ہے کہ کیا اخلاقیات کی ایسی پستی بھی ممکن ہے جہاں تمام اخلاقی قدروں کو زوال آ جاتا ہے۔ مصنف ہر قدم پر روایت کی پاس داری کرتا ہے اور تہذیب کی اس دم توڑتی تصویر کو بھی اس طرح دکھایا ہے کہ مادہ پرست انسان خواہشات کے چنگل میں ایسا پھنس جاتا ہے فرار کی کوئی گنجائش

باقی نہیں بچتی اور یہ لامتناہی سلسلہ اس کا موت تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ذہنی تناؤ کا شکار زندگی سے فرار کا ہی راستہ اپنے لیے آسان سمجھتا ہے اور خود کو حالات کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال مصنف مذکور نے کہانی میں بیان کی ہے۔ ضامن کو شیزہ سے محبت بھی ہے اور اس کا ذہن حقیقت کو قبول کرنے سے انکاری بھی ہے۔ وہ حالات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

''جب وہ میرے کمرے میں ہوتا ہے عین اسی وقت شیزہ کا بوائے فرینڈ شیزہ کے ساتھ ہوتا تھا یہ بات میرے لیے عجیب مخمصہ پیدا کیے ہوئے تھی''(26)

ناول نگار نیان لوگوں کی زندگی کو حقیقت سے آشنا کیا ہے جو بے آسرا ہوتے ہیں اور پھر گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں ایسا چنگل جس سے موت کے علاوہ فرار جیسا کوئی راستہ نہیں۔ شیزہ اور ذیشان دونوں بہن بھائی جو کہ پہلے ہی گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے وہ ظفر عالم جیسے لوگوں کے ہاتھ آ گئے اور اس طرح ان کی بربادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ انسان جو بے آسرا ہوتا ہے اسے مزید لوٹنے کیلئے چاروں طرف سے درندے آ جاتے ہیں۔ ضامن کو جو کام ظفر عالم کی طرف سے ملا اس کی نوعیت کچھ یوں تھی کے اسے مختلف پارٹیز اور رسالوں کے لیے ہونے والے فنکشنز کی رپورٹ تیار کرنا تھی۔ یہ رسالے اشتہا انگیز تصویروں کے ساتھ اس رپورٹ کو چھاپتے تھے اور اندھا دھند پیسہ کماتے تھے۔ لیکن ان سب حالات پر ضامن کے پاس کڑھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مصنف کے مطابق پارٹی میں موجود لوگوں کو شراب کے نشے میں دھت ہونے کے بعد ان کے حالات کو نزدیک سے جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ باتیں جتنی تفصیل سے اور عریانی سے پیش کی جائیں گی اتنا ہی پیسہ کمایا جائے گا۔ باتوں کو ننگا کرنے کے ساتھ ساتھ فحش تصویروں کو بھی رسالوں کی زینت بنایا جاتا اور مقصد صرف پیسہ۔۔۔ اور بس پیسہ ہوتا!

''میں یہ بھی جان گیا تھا ظفر عالم اور اس کی بیوی پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ سیکس مارکیٹ کا بزنس بھی کرتے تھے۔ ان کی یہ مارکیٹ ملک سے باہر بھی تھی اس میں سیکس کی تمام اقسام پائی جاتی تھیں مگر یہ مہنگے

داموں بکتی تھی۔ان گیز لیز بیئن اور عام سیکس یعنی ہر قسم کی ضروریات
ان کے پروڈکشن ہاؤس میں چلتی تھی''(27)

بعض اوقات انسان ایسے ماحول میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے جہاں اسے سب اپنے کام سے کام رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مگر جب وہ ان کے اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کیچڑ اور تعفن زدہ ماحول میں آ گرا ہے۔ضامن پہ جب یہ ساری حقیقت کھلی تو وہ کراہت محسوس کرنے لگا۔ناول نگار نے شوبزنس کرنے والوں کی اصل زندگی کی نشاندہی کی ہے۔وہ روشنیوں میں گم زندگی گزار رہے ہوتیہیں اور حقیقی زندگی میں وہ اندھیروں کو ہی اپنا اصل پردہ سمجھتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے علاقے اور بستیاں ہیں جو کہ ان جرائم کی نرر ہو چکی ہیں۔اسی طرح کی زندگی گزارنے پہ مجبور بھی ہیں اور پھر کچھ کو ایسی لت بھی آ لگتی ہے کہ وہ اس سے چاہ کر بھی نہیں نکل پاتے۔ناطق نے سیکس کی ایسی دنیا دکھائی ہے جہاں پر والدین خود اپنی اولاد کو اس میں دھکیل رہے ہوتے ہیں اور وہ اس کو اپنا کام سمجھتے ہیں۔وہ اولاد کو مچھلیاں پھانسنے کا ایک چارہ سمجھتے ہیں اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ پارٹی میں کسی فارن کے بیٹے کو پھسالے لیں اور ان کے تمام معاملات درست ہو جائیں ایسی ہی صورت حال ناطق نے ظفر عالم اور اس کی بیگم کی بتائی ہے۔ظفر عالم اور اس کی بیگم جو بظاہر ایک معزز زندگی گزار رہے ہوتیہیں اصل میں وہی اس سارے نظام کو چلا رہے ہوتے ہیں۔

ناول میں مصنف نے ظفر عالم کی بیویکو پروڈکشن ہاؤس کا بنیادی سرا بتایا ہے اور وہ یہ حقیقت بتانا چاہ رہے ہیں کہ اصل میں معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے والے لوگ ہی خود کو شرافت کے لبادے میں چھپا کر ایک مکمل نیٹ ورک چلا رہے ہوتے ہیں۔ان کے روابط عام آدمی سے لے کر اوپر تک اعلیٰ عہدوں پر براجمان افسران سے بھی ہوتے ہیں یہ راستے میں ایک پل کے طور پر ہوتے ہیں اور بے چارے غریب، بے بس لوگوں کو پیسوں کا لالچ دے کر انھیں غلط کاموں کیلئے مجبور کرتے ہیں۔ناطق لکھتے ہیں:

''سب سے زیادہ متحرک ظفر عالم اور اس کی بیوی تھی۔جیسے وہ اپنی

آڑھت پر کھڑے گاہکوں کو جنس کی خریداری پر آمادہ کر رہے ہوں
اور ان کے کمیشن میں اضافہ متوقع ہو'(28)

آہ! کیا صورت حال پیش کی گئی ہے کہ والدین خود اپنی سگی اولاد کو سیکس کی طرف مائل کرتے ہیں اور فارنرز کے ساتھ تعلقات کیلئے انھیں دوسرے ممالک تک بھیج دیتے ہیں۔ یقیناً مصنف نے اپنی نثری مہارت کے جوہر دکھائے ہیں اور اس پس ماندگی کا پردہ فاش کیا ہے۔ ایمبیسڈرز کے ساتھ یہ تعلقات صرف یہاں پر ہی ختم نہیں ہوجاتے تاحیات وہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی مچھلی پیش کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ محفلیں سجتی رہتی ہیں، کبھی نہ ختم ہونے والی محفلیں، قاری ان حالات وواقعات کو پڑھ کر رنجیدہ ہوجاتا ہے اور ایک عجیب کیفیت کو خود پہ حاوی کر لیتا ہے۔

کسی بھی کہانی میں جو مضبوط تانا بانا ہوتا ہے وہ اس کے کردار ہوتے ہیں۔ کردار متحرک ہوں تو گویا کہانی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ واقعات کا تانا بانا بنا جانا اور پھر ان سب کے تعلق سے زندگی کی معنویت اور اس کی داخلی وخارجی قوتوں، رشتوں اور دنیا کے دیگر حقائق کی تلاش کی جاتی ہے۔ تب ہی کہانی میں جان پیدا ہوتی ہے کردار متحرک نظر آتے ہیں۔

واقعات اور مکالمے حقیقی زندگی سے قریب تر نظر آتے ہیں اور یہ ایک طرح سے سماج کی تصویر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس نے ایک ایسی پارٹی کا حال واحوال بھی کہانی میں بیان کیا ہے جو نہایت دلگیر ہے۔ ملک کے ساتھ وفاداری کی یہ کونسی نئی صورت حال تھی۔ کیا کوئی اور طریقہ نہیں کہ ملک کی خدمت کی جاسکے۔ یہ بیوروکریٹ اور سیکرٹریز کو ایک ہی لالچ کیوں ہے، وزارت خارجہ کی یہ محفلیں صرف اس لیے سجائی جارہی تھیں کہ انھیں منافع ہو یا وہ خود کو ملک کے نام پر ہی اسے بھی جہاد میں شامل کر رہے تھے۔ بہرحال مصنف نے حقیقت کو کچھ یوں اجاگر کیا ہے:

''ایک آدمی جسے میں نے ایک دفعہ سرسری ایڈیشنل سیکرٹری کے طور
پر وزارت خارجہ میں دیکھا تھا اور اب وہ فل سیکرٹری ہو چکا تھا۔ اپنی
بیٹی کو بار بار ایک فارنر وزیر کے بیٹے سے ملواتا تھا مگر وہ لڑکی کچھ ہی لمحوں
بعد دور جا کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس بات پر سیکرٹری صاحب تھوڑا

مضطرب نظر آرہے تھے۔والدین جو زیادہ بیوروکریٹ تھے اس بات پر خوش تھے کہ انھوں نے آج اپنی شام ضائع نہیں کی تھی۔ڈرنک کے ساتھ ساتھ عالمی اور خارجی امور بھی نپٹائے جارہے تھے۔انھیں اپنے دل کو مطمئن کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا کہ وہ یہاں ملک کی خدمت میں اپنا وقت صرف کررہے ہیں''(29)

ناول نگار نے پروڈکشن ہاؤس میں سیکس انڈسٹری کا نقشہ مکمل اجزائے ترکیبی سے کھینچا ہے۔شروع سے آخر تک تمام صورت حال دکھائی گئی ہے منظر نگاری کچھ یوں بیان کی ہے کہ قاری کا ذہن اسے محسوس کرسکتا ہے کہ کس قدر شراب کی اور نفسانفسی کی محفل سجی ہوئی تھی۔

انسان اپنے پاکیزہ رشتوں کو بھی اپنی ذاتی تسکین کیلئے خود کو اور ملک کو دھوکا دے کر استعمال کررہا تھا بلکہ سولی پر لٹکا رہا تھا۔اپنی عمر کے تقاضوں کو بھول کر جسم لہرا رہے تھے۔ان خواتین میں سے اکثر کے شوہر اپنی بیویوں کو چھوڑ کر دوسری عوتوں کی طرف متوجہ تھے اور عمر کے اس حصے میں جب کہ جسم پر گوشت بھی ہڈیوں کو چھپانے میں ناکام ہوتا ہے۔ناول نگار نے ایسی عورتوں کو ناول میں اون اتاری ہوئی بھیڑیں کہا ہیا ور ایک جملہ جو نہایت ہی بری حالت کو بتانے کیلئے کافی ہیوہ یہ تھا کہ ان عورتوں کی حالت ایسی معلوم ہورہی تھی کہ گویا زیادہ دودھ دھونے کے سبب ہڈیاں واضح ہوگئی ہوں۔رقص،موسیقی،شراب،مبیک اور ہنگامہ میں ان سیکرٹریز بزنس مین،وزرا اور ایمبیسڈرز کو دکھایا گیا ہے جن کے ہاتھوں میں اس ملک کی تقدیر لکھی ہوئی ہے۔اپنے دفتروں میں بیٹھے یہ لوگ کس قدر سنجیدگی کے ساتھ اپنے ملک کی خدمت میں ،میں حاضر کا نعرہ الاپتے اور قانون کی پاسداری کرتے ہوئے ہر دستہ اول نظر آتے ہیں۔ناطق لکھتے ہیں :

''یہ وہ لوگ تھے جو اپنے فیصلے کی سرکاری کرسی پر بیٹھے ہوئے نہایت سمجھدار اور بارعب ہوتے ہیں۔وہاں ان کی میز پر آئی فائل گویا کیکڑے کے منہ میں پھنس جاتی ہے۔''(30)

ناول نگار نے اس طبقہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اپنے بچوں کو مرنے کے خوف سے خود

سے دور رکھتے ہیں دور دراز پڑھنے کیلئے بھیج دیتے ہیں یا پھر انھیں ہوسٹل لائف کے علاوہ اپنے عزیز واقارب کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ یہ بچے باہر کیسے ماحول میں زندگی گزارتے ہیں اور بعض اوقات حالات ہی انھیں اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ شروع میں وہ اپنے آپ کو حالات سے بچانا چاہتے ہیں پھر بچاتے بچاتے خود کو حالات کے سپرد کر دیتے ہیں ناطق نے ایسے ہی دو بہن بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔ جو جائیداد کے تنازعے سے بچنے کیلئے ان حالات کی نذر ہو گئے۔ یہ انتہائی تشویش ناک بات ہے قاری کے لئے، کس قسم کی حقیقت ہے یہ دونوں بہن بھائی ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہوئے مختلف حالات میں خود کو کیسے حالات کے سپرد کرنے کے لئے تیار ہوتے گئے یہاں ایک نفسیاتی کشمکش کی فضا پیدا ہو جاتی ہے:

''اب مجھے اس فلیٹ میں آٹھ مہینے ہو گئے تھے۔ میں ان بھائی
بہنوں کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ دونوں سیکس ورکر تھے'' (31)

بہر حال ناول نگار نے ایسی دلدل کا ذکر کیا ہے کہ جس میں انسان بوڑھا ہو کر بھی نکلنے کا خیال اپنے تصور میں نہیں لاسکتا۔ بوڑھے ہو جانے پر بھی ایسے لوگوں کو دوسرے کاموں میں ملوث کر دیا جاتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ یہ بندے ہمیشہ کیلئے ہمارے ساتھ اس طرح ملوث ہو جائیں کہ واپسی کا کوئی راستہ خود ان کے پاس بھی نہ ہو۔ ایسی ہی صورت حال میں خود ظفر عالم اس سب کیپیچھے جس کا ہاتھ ہے، وہ اور اس کی بیوی عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے ہیں جہاں اب وہ ویسی زندگی نہیں گزار سکتے۔ جب وہ جوان تھے اور سیکس کرنے کیلئے توانا۔ ان حالات میں وہ لوگ ٹرینر بن جاتے ہیں۔ ظفر عالم کی بیوی بھی ایک ٹرینر بن گئی وہ لڑکیوں کو چلنے کا، بولنے کا اور کس طرح سے بات کر کے اگلے کو ڈیل کیلئے تیار کرنا ہے یہ انداز سکھانے لگی۔ یہاں ناول نگار نے مڈل کلاس طبقہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھانے آتے ہیں اور جب وہ کامیاب نہیں ہو پاتے تو انہیں اس دلدل میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ کچھ کو خود ہی ناکامی کے راستے پہ جان بوجھ کر بھی چلایا جاتا ہے اور بعد میں ان کو اس کام کیلئے مجبور کیا جاتا ہے۔ ایک سٹوڈیو بنایا جاتا ہے اسپیشل ڈیٹنگ ہاؤس بھیجا جاتا ہے وہاں ان کو فلموں سے زیادہ پیسہ مل جاتا ہے کیونکہ یہ غریب گھر سے طبقہ ہوتا ہے عموماً وہ خود کو اس لیے جسم فروشی کی نذر کر دیتی ہیں اور اس دلدل میں پھنس جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر لڑکیاں عرب شیخوں کی طرف بھیجی جاتی ہیں۔

انھیں ٹورز کے نام پر دبئی اور عرب ممالک کے چکر لگوائے جاتے ہیں۔ پھر ان کی ادائیگی ڈالرز کی صورت میں ہوتی ہے مگر ان لڑکیوں کو اس میں سے کم ہی معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ظفر عالم کا مقصد صرف یہ تھا کہ جو سیکس کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے وہ کسی صورت باہر کا رخ نہ کرے۔

''اس کے خیال میں کچھ مدت بعد لڑکی جب یوز لیس ہو جاتی ہے تو ڈپریشن میں چلی جاتی ہے۔ اس وقت اس کے لئے ایک بنیادی سہارا ضرور ہونا چاہیے جو آزاد خیال اور سیدھا سادہ ہو'' (32)

ناول نگار نے اب ان لوگوں کی اگلی کاروائی کو بھی اجاگر کیا ہے کہ کوئی جب الٹا ان پہ اپنے ہاتھ تنگ کرے اور ان کو تنگ کرے تو ظفر عالم نے ان کے لئے بھی اقدام کر رکھے تھے۔ ناول نگار نے من وعن بیان کرنے کی سعی کی ہے جس میں وہ مکمل کامیاب رہے ہیں مصنف مذکور نے بتایا ہے یہ لوگ اپنی چال میں اس قدر پکے ہوتے ہیں جب کوئی ان کو پکڑنے کی کوشش کرے تو اس کے لیے سب انتظامات انہوں نے کر رکھے ہوتے ہیں۔ اوپر تک ان کی پہنچ ہوتی ہے یہ ان کے کالے کارناموں کو چھپا رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر کبھی ان کی طرف سے کوئی کارروائی ہو یا کسی ناراضی کا اظہار ہو تو اس طرف سے ان کی ملاقاتوں کی مکمل ویڈیو کے ذریعے نہ صرف ان کو بلیک میل کیا جاتا ہے بلکہ خود کو بھی بچا لیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کا یہ کالا دھندا چلتا رہتا ہے نہ ان کو کوئی خوف ہوتا ہے، اور نہ ہی ڈر مصنف نے اس صورت حال کو اس طرح بتایا ہے۔

''جب مجھے کسی آدمی کے ڈرائنگ روم میں بھیجا جاتا تھا، میری انگلی میں انگوٹھی اور میرے بالوں میں لگے کلپ اصل میں کیمرے ہوتے تھے'' (33)

ایک مکمل سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے مطابق یہ کام ہوتا ہے، ان کی مکمل سیکس ویڈیو بنتی ہے تو سیکس ورکر اور کلائنٹ، دونوں کی ڈوری ڈیلر کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آخر میں ناول نگار نے ساری تفصیل کے بعد ایک ایسی بات قاری کے ذہن پہ چھوڑ دی ہے جسے وہ مسلسل سوچتا رہتا ہے اور نہایت کرب کے عالم میں وہ وقت گزارتا ہے۔ ''ضامن'' کافی دن سے محسوس کر رہا تھا کہ شیزہ کا دل اب بھر

گیا ہے جیسے وہ قطع تعلق چاہتی ہے۔

وہ شیزہ کو کہتا ہے کہ کیا وہ یہ کمپنی چھوڑنا چاہتی ہے کیا ظفر عالم کی طرف سے اسے کوئی صدمہ پہنچا ہے تو وہ جاننا چاہتا ہے تاکہ شیزہ کا دل تھوڑا ہلکا ہو تو ایک عجیب حقیقت اس کے سامنے آتی ہے۔ناطق نے انسانی سائیکی کا مکمل امتحان لیتے ہوئے قاری کو ان حالات سے دو چار کیا ہے۔جس میں قاری کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ لامتناہی سوچوں کی قید میں مقید ہو جاتا ہے یعنی اس سارے نظام کو اصل میں کون چلا رہا ہے،خود شیزہ بھی نہیں جانتی۔یہ سب ایک شطرنج کے مہرے ہیں جو کسی کے ہاتھ میں ہیں اور کھیلنے والا اپنی مرضی سے چال چلتا ہے۔ناطق نے پورے قصے کا خلاصہ کیا ہے جس میں انھوں نے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے قاری کی قلبی کیفیت کو برقرار رکھا ہے۔

> ''ضامن تم نہیں جانتے یہ ظفر عالم کا پورا آفس بلیک میلنگ کا ایک کریہہ دھندا ہے،جس میں ظفر عالم اور اس کی بیوی خود بلیک میل ہو چکے تھے۔تم شکر کرو تمہیں کسی راز کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ضامن راز جان لیوا ہوتے ہیں مجھے ان رازوں نے ہلاک کر دیا ہے۔میں جسے اپنا فن سمجھتی تھی وہی اصل میں میری ذلت تھا۔ضامن کبھی اہم مت ہونا،اہم ہونا بہت بڑی ذلت ہے۔ہر مچھلی دوسری مچھلی کا چارا ہے اور دوڑ کے پیچھے ایک دوسری ڈور بندھی ہے۔میں تو اس دوڑ کا بہت آخری حصہ ہوں اور یہ ظفر عالم بھی۔اس کا پہلا سرا نہ مجھے معلوم ہے نہ ظفر عالم کو''(34)

ناول نگار نے عہدوں پر براجمان لوگوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ لوگ کس طرح سے اپنی ترقی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور کس طرح وہ سیٹوں کو چھن جانے سے بچاتے ہیں۔افسران اور بزنس مین بیویوں کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں جہاں کہیں بھی ان کو موقع ملتا ہے تو وہ صاحب اختیار یعنی ایسے بندوں کو پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور اپنے بیگ میں سے قیمتی شراب نکال کر پلاتی ہیں۔اس طرح وہ شناسی اور واقفیت میں اس طویل سفر کو گھنٹوں میں طے کر لیتی ہیں اور اپنے کام نکلوا لیتی ہیں۔اس لیے

یہ عہدوں والے افراد اکثر دو دو بیویاں رکھتے ہیں ایک کے بوڑھے ہوتے ہی فوراً دوسری جوان بیوی رکھ لیتے ہیں تاکہ ان کے کام نہ رکیں۔ ناطق نے حالات کا بہت اچھا آئینہ دکھایا ہے جس میں ہر دھندلائی ہوئی تصویر واضح نظر آرہی ہے۔

''جہاں کام بلاک ہو چکا تھا ان نوجوان بیگمات کو وہاں ٹارگٹ کیلئے دیا جاتا۔ اکثر پارٹیاں یہی ٹارگٹس اچیو کرنے کیلئے کی جاتی تھیں۔ مجھے حیرت تھی ملک کے اکثر بڑے عہدوں پر براجمان لوگ ایسی بیگمات سے ہراول دستوں کا کام لیتے تھے۔ خاص کر ججز حضرات کے ہاں نوجوان بیگمات کی کثیر تعداد موجود ہوتی تھی اور مختلف پارٹیز میں وہی زیادہ تر پیش پیش ہوتیں'' (35)

ناول نگار نے مکمل تفصیل کے ساتھ ان سارے حالات کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے اور یہ ایک نہایت جرات مندانہ جسارت ہے۔ وہ روح کو جذب کر کے بڑی دردمندی اور سنجیدگی کے ساتھ باطنی قرض سمجھ کر ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے حالات وواقعات کو قرینے کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

ادب کے نام پر فحش رسالے چھاپنا

ایسے موضوعات جن میں جنسیت پر لکھا گیا ہو اسے فحش نگاری کہتے ہیں۔ جس کا صرف اور صرف مقصد جنسی تسکین وراحت ہے اس میں مختلف قسم کے یعنی متنوع ذرائع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مختلف کتابیں جو جنسی اشتہا کو بڑھاتی ہیں، رسالے جن میں فحش تصاویر اور مواد شامل ہوتا ہے۔ تصاویر کے علاوہ کچھ خاکے صوتی مسجل، سیکس پر مبنی فلمیں یہ تمام فحاش نگاری کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ یہ سراسر غیر قانونی کام ہے اور ان کی بڑی تعداد محلوں میں شائع ہوتی ہے لیکن دیکھا جائے تو اصل میں سب سے بڑا فحش نگاری کا ذرائع انٹرنیٹ ہے۔

جیسے جیسے انٹرنیٹ کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے ویسے ویسے فحش نگاری بھی جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔ ایسا بھی ہے کہ ملک کے بیشتر حصوں میں اب اس عنوان پہ بولنا رسماً ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ نسلیں

اس سے تباہی کی طرف بڑھتی ہیں معصوم بچے اپنی معصومیت کھو دیتے ہیں۔ایسے ہی ناول نگار نے بھی ایک فحش کہانیاں چھاپنے والے کا ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ناول کی جگہ سچ میں وہاں ہوتی ہے جہاں تاریخ کے صفحے سادہ اور خاموش ہوں وہ واقعات جو صاف دکھائی نہ دیتے ہوں انھیں صاف واضح کر کے ناول نگار دکھاتا ہے۔اپنے ایک عیسائی کردار کے ذریعے جس کا نام ''یوحنا'' ہے اور دوسرا کردار شیخ سیف اللہ جو کہ ایک رسالہ چھاپتا ہے جس میں فحش تحریروں کے علاوہ تصاویر بھی ہوتی ہیں اور کچی بستیوں میں وہ رسالہ بیچتا ہے ایک طرف تو لوگ اگلی کہانی کے انتظار میں ہر اشاعت کو خریدتے ہیں اور دوسرا جولت ان کو لگ جاتی ہے وہ اسے چھوڑ نہیں پاتے۔ایسا لٹریچر معصوم بچوں کو ذہنی اور جنسی مریض بنا کر رکھ دیتا ہے۔یہی رسالہ جات لکھنے کیلئے ضامن کو بھی جب کہا گیا تو پہلے تو اسے علم نہیں تھا جب پتہ چلا تو اس پہ کیا گزری۔

> "ابھی دو تین صفحے پڑھے تھے کہ میرا سر گھومنے لگا۔اوہ! میرے خدایا، یہ کیا لکھا ہوا ہے؟ یہ تو ایک ہولناک قسم کی ٹرپل ایکس سٹوری تھی۔ایک لڑکا اپنے دوست کے ساتھ مل کر اپنی بہن کے ساتھ سیکس کرنے چلا تھا''(36)

ناول نگار نے ایسی حقیقت کو بے پردہ کیا ہے جس کو پڑھ کر قاری سکتے میں آجاتا ہے۔ نہایت ہی واہیات قسم کی یہ کتاب تو قانوناً جرم ہونا چاہیے جو بچوں سے ان کی معصومیت چھین لیتا ہے۔ایسا کام کرنے والوں نے اخلاقیات کو نچلے درجے پر گرا دیا ہے۔اگر کوئی ناول انسانی سائیکی کی تمام جہتوں پہ مطالعہ پیش نہ کرے تو وہ ناول بیکار ہے۔شہوت دلانے والے بیکار رسالے جس کو پڑھ کر بدفعلی کے علاوہ کچھ نہیں سوجھ سکتا یہ ناول صرف اور صرف لٹریچر سے بیگانگی اور بیزاری پیدا کرنے میں معاون ہوگا۔

ناول نگار نے ایک اور حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ جہاں قانون ہی ایسے جرم کی پاسداری کرے وہاں کوئی کیا کر سکتا ہے۔جب حقیقت کو بتانے کیلئے تھانے کا رخ کیا تو وہاں اسے تھانیدار بھی مشکوک لگا وہ بات سن کر حیران ہونے کی بجائے اس بات میں دلچسپی لینے لگا کہ ضامن کون ہے۔یعنی اب تھانیدار یہ تسلی چاہتا ہے کہ ضامن کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں یہ اکیلا ہے یا پھر اس کے پیچھے بھی کوئی ہے۔اکثر شکایت

کرنے والے کو ہی جیل میں بند کر دیا جاتا ہے تا کہ کام چلتا رہے۔

''مجھے محسوس ہوا کہ تھانیدار کو ان رسالوں اور ان کے فروخت کنندگان کے متعلق پہلے سے علم ہے۔اب یہ قضیہ مجھ پر ہی واپس ڈال دیا جائے گا''(37)

ناول نگار نے ایک مکمل تحریر لکھی ہے جس میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے اور کیا نتائج نکلتے ہیں۔ناول نگار نے ان ادیبوں کا بھی راز فاش کیا ہے جو بہت اچھے خاصے ہیں اور خوب شہرت حاصل کر چکے ہیں اور پھر بھی ایسی کہانیاں لکھتے ہیں اور اپنے نام کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ایسی کہانیاں لکھنے کیلئے وہ چور گلیاں اور چور راستے تلاش کرتے ہیں جہاں ان کا نام پتا کوئی نہ جانتا ہو اور ان کی آمدن بھی نہ رکے۔وہ بالکل اس بات سے انجان ہیں کہ وہ نہ صرف بچوں کا مستقبل خراب کر رہے ہیں بلکہ ملک کے مستقبل کو بھی داؤ پر لگا رہے ہیں۔ایسا لٹریچر جب اس کو مریض بنا دے گا تو وہ انسان کی بجائے بھیڑیا بن کر نکلیں گے۔ایسے ادیبوں کو بھی مصنف نے ذہنی مریض ہی کہا ہے:

''اس مولوی کا کہنا تھا کہ یہ ان سب میں بہترین اسٹوری ہے اور مجھے اس سے آگے جانا ہے تو خدا جانے وہ کیا ذلالت کی منزل تھی جہاں میں نے جانا تھا۔اس سے بڑھ کر یہ بات کہ ان کے لکھنے والے نامی گرامی مصنف ہی نہیں بلکہ ٹی وی کے اکثر ڈراما نگار بھی تھے اور ہزاروں کما رہے تھے''(38)

مصنف نے ایک اور حقیقت کو اجاگر کیا ہے یوحنا کے کردار سے جوان کہانیوں کو پڑھتا ہے اس کا گھر کچی بستی میں ہے اس نے اپنے گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ایک میں وہ خود بیوی بچوں سمیت رہتا ہیاور دوسرے کمرے میں اس عیش وعشرت کا سامان کر رکھا تھا اپنے مڈل کلاس دوستوں کیلئے شراب اور عیسائی لڑکیاں بھی پیش کرتا ہے جو کم قیمت پہ یہ سب کرنے کیلئے تیار ہو جاتی ہیں۔جوان گمنام کچی آبادیوں میں بہت زیادہ تعداد میں پائی جاتی ہیں اور شہوت بڑھانے کیلئے بھی ہر وقت اس کام میں خود کو ملوث رکھتی ہیں۔

یوحنا کا کردار جو کے بالکل ان رسالوں کو پڑھ پڑھ کر غلط درست کی پہچان بھول چکا ہیاس نے عار محسوس نہ کی کہ ضامن ادیب ہےتو اس طرح لٹریچر اسے لکھنے کیلئے آمادہ کرلے گا اپنے ہی گھر میں جہاں اس کی بیوی اور بچے رہتے ہیں اسے اس نے غیر ضروری ناجائز کاموں کا ڈیرا بنا رکھا ہے۔اصل میں ناول نگار یوحنا کے کردار کے ذریعے ان بچوں کے مستقبل کی جھلک دکھا رہے ہیں جو آگے چل کر نئی نسل کو برباد کردیں گے۔جن کی وجہ سے ملک کا مستقبل خطرے میں آجائے گا۔

جس طرح یوحنا اس ساری ناجائز حرکات کو کرنے پہ نادم نہیں اسی طرح آنے والی نسل بھی نادم نہیں ہوگی اور وہ برائی کا ارتکاب کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرے گی۔جیسے یوحنا کو ایسا جواب دینے میں بھی شرم محسوس نہ ہوئی جب ضامن نے کہانی لکھنے سے منع کردیا:

> ''دیکھو ایسا نہ کرو، آپ کون سا اپنا نام ان پر لکھیں گے؟ کتنے ہی لوگ اس طرح کی کہانیاں لکھ کر پیسے کمارہے ہیں۔جب انھیں کوئی فرق نہیں پڑا تو آپ کو کیا پڑے گا؟''(39)

ناول نگار بالکل ایسا قصہ بیان کرتے ہیں جس میں پوری ایک زندگی بیان کی جاتی ہے اور یقیناً اس ناول میں مصنف نے ایک ساتھ کئی زندگیوں کو لکھا ہیجو مذہبی، اخلاقی، سماجی اور معاشرتی پس ماندگیوں کا شکار ہیں۔

مذہبی زوال کی عکاسی (خصوصاً شیعہ مسلک سے زیادتی)

شروع ہی سے یہ مسائل دیکھنے کو ملے یعنی برصغیر ہی سے یہ مذہبی زوال کی عکاسی رہی ہے۔شیعہ اور سنی دونوں ہی خط مستقیم پر نہ رہے۔اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ دونوں خط مستقیم پر نہیں ہیں۔اکثریت نے ہمیشہ اقلیت کو دبایا اور اس کے اثرات کس شکل میں ظاہر ہوئے یہ کوئی راز نہیں رہا۔ناطق نے کہانی میں حاجی فطرس علی کا ذکر کیا ہے۔یہ وہ مضبوط کردار دکھایا گیا ہے جو شیعہ مسلک سے آگاہی دیتا ہے۔

ضامن نے علمی وادبی گروہ کے ساتھ راہ وراست یکجا کیے تو کامریڈ نے کچھ کتابیں ضامن کو دی کہ ان کو پڑھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ مذہب کتنا بڑا جھوٹ ہے اور ہم سب کیا ہیں۔ضامن نے ان کتابوں کو پڑھا اور پھر جب ان ہی پر بحث کرنا چاہی تو ضامن کو پتہ چلا کہ خود انہوں نے بھی روایتی

باتوں کے علاوہ کچھ نہیں سیکھا۔ ناطق نے ناول میں لکھا ہے کہ جب ضامن کو اس کے کامریڈ ساتھی نے کہا کہ آج تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ پہلے اس نے غور سے ضامن کو دیکھا اور پھر کہا کہ کامریڈ الیاس جو کہ میرے استاد ہیں ان کی دو بچیاں ہیں۔

الیاس صاحب کی بیماری کی کسی کو سمجھ نہیں آتی۔ تمہیں پتہ ہے کہ ہمارا کسی بھی مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ وہ ضامن کو کسی چال میں لینا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی شیعہ تھا اور جہاں مفاد کی بات آتی تب وہ اپنا تعلق ہر مذہب سے ختم کر کے صرف پیٹ کی بات کو سنتا۔ کیونکہ الیاس صاحب سنی ہیں۔ ضامن نے معاملے کی تہہ کو بھانپ لیا یعنی سنی عقیدے میں ان کی آدھی جائیداد کے وارث ان کے بھتیجے ہوں گے اور بیٹیوں کے حصے میں بہت کم آئے گی۔ ناول نگار نے لالچ کی خاطر مذہب سے غداری کرنے والوں کا اصلی چہرہ دکھایا ہے۔

> ''سنا ہے مذہب جعفریہ میں اصول مختلف ہیں۔ باپ کے مرنے کے بعد اگر اولاد میں کوئی بیٹا نہیں، صرف بیٹیاں ہیں تو ساری جائیداد بیٹیوں کے حصے میں برابر تقسیم ہوتی ہے۔ کامریڈ الیاس صاحب کا کوئی بیٹا نہیں صرف بیٹیاں ہیں''(40)

مطلب ناول نگار نے سیدھا ان لوگوں پر کاری ضرب لگائی ہے جو لالچ کی خاطر پیٹ بھوک اور مال و دولت کو ہی اپنا مذہب سمجھتے ہیں اور جہاں منافع ہو وہ اسی مذہب کے ہو جاتے ہیں کامریڈ نے ضامن سے جب کہا کہ تم شیعہ ہو، سلام بھی کہتے ہو، تو تم یہ گواہی دیدینا کہ الیاس صاحب شیعہ ہو چکے تھے۔ سب کام خفیہ رہے گا کسی کو کان و کان خبر بھی نہیں ہوگی۔ ضامن یہ بات سن کر، میں طاقت نہیں رکھتا کہ سنی مذہب کے تمام اصول وضوابط اور قواعد کو رد کر کے بدل دوں اور نہ ہی میں ایسا کام کرنے کی سفارش کر سکتا ہوں۔ ناول نگار نے کامریڈ کے کردار سے لالچی لوگوں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح شیعہ ہو کر اپنے مذہب کے لیے ایک داغ کی صورت تھا۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات ختم نہیں ہوتے ہیں۔ مفاد پرست موقع نہیں دیکھتے، ادھر کے ہی ہو جاتے ہیں جدھر کی ہوا چلے اور اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اس آگ میں جلانے کا پورا بندوبست کیے رکھتے ہیں۔ یہ بات حقیقت کے بہت قریب ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں

جوخود پر خول چڑھا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ان ہی موقع پرست لوگوں کی نشاندہی ناول نگار نے کی ہے کہ یہ لوگ لالچ کی خاطر اپنے مذہب سے بھی کھیل سکتے ہیں۔

''شیعہ مذہب کی قبولیت کا خط ہم نے سید غضنفر نقوی سے لیا ہے۔ جب عدالت میں پیش ہوں تو آپ نے بس اتنا کہنا ہے، الیاس صاحب نے ہمارے سامنے شیعہ مذہب قبول کیا ہے۔گواہی کے طور پر خط میں آپ کا اور سید علی زیدی کا نام درج ہے''(41)

کامریڈ کی باتوں پر ضامن کو جب غصہ آیا تو ناول نگار نے یہاں لوگوں کی سفا کی اور خصلت کو بیان کیا ہے۔مسلک بندی کے اس شیرازے میں اقلیت کس طرح زور پکڑتی ہے اور کس طرح بنتی بگڑتی ہے۔ناول نگار نے اس کی مکمل تصویر دکھائی ہے۔یہ لوگ خود ہی اپنی مرضی سے عمارت کو بناتے ہیں اور ضرورت کے وقت اسے گرا بھی دیتے ہیں۔ضامن نے جب بہانہ کیا کہ وہ گواہی نہیں دینا چاہتا کیونکہ وہ ان کا امتی نہیں ہے،تو کامریڈ نے طنزاً کہا کہ جج نے تم سے بس گواہی لینی ہے۔تصدیق کے طور پر جج کی ماں کو کونسا کانٹا چبھنا ہے جو وہ گواہی تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔اس نے ضامن کو دھمکی دی کہ گواہی دینی ہے تو دو ورنہ تم جیسے مومن تو ہر وقت ہماری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ناول نگار نے شیعہ مسلک کا مزاح اڑانے کا واقعہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

''کامریڈ ایچ اے ہنس کر بولے، دونوں سید رکھ لیتے تو کیا معلوم وہاں سچ بول دیں، بھائی ان سید لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں، کب صادق اور امین بن جائیں۔ ہر وقت انقلاب کے درپے ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس راہ کے مخالف چلتے ہیں،جس راہ خلق چلتی ہے''(42)

ناول نگار نے شیعہ مسلک افراد کا مزاح اڑاتے ہوئے یوں کہا ہے کہ یہ لوگ موقع پرستوں کی طرح اپنے آس پاس دیکھتے رہتے ہیں اور جہاں ان کو جس بھیس کی ضرورت پڑتی ہے، وہ لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ان کے دل میں جو آتا ہے یہ کرتے ہیں۔وہ ایسا ان شیعہ افراد کیلئے تاثر رکھتے ہیں جن کے پاس اشرافیہ کے اختیارات ہیں۔

انہوں نے شیعہ لوگوں کی اشرافیہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ لوگوں کو بیوقوف بناتے

ہیں۔شیعہ سرمایہ دار اور جاگیردار اپنی چالوں کو کامیاب بنانے کے لیے ایک دوسرے کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں۔کبھی احتجاج، کبھی جلسے، یہ تمام جاگیردار اور سرمایہ دار خود کبھی کسی جلسے اور جلوس میں نظر نہیں آئیں گے مگر پیچھے سب کو لگا لیں گے۔غریبوں کو چند پیسے دینے کے عوض انہیں مرنے کے لیے آگے لگا دیں گے۔سنی اور شیعہ لوگ بظاہر تو ایک قوم ہی ہیں لیکن وہ بالکل لاعلم ہیں یعنی اختیارات رکھنے والے اپنے فائدے کے لیے ان کو بڑی قربانی دینے کے لیے اشرافیہ کے آگے دھکیل دیں گے۔حاجی فطرس علی نے ہر بات ضامن پر عیاں کر دی کہ شیعہ فسادات خود ان کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں۔ضامن سے جب حاجی فطرس نے پوچھا کہ تم کوئی نوکری کرتے ہو تو اس نے کہا نہیں بلکہ کتنے اشرافیہ اور زمینداروں سے کہا ہے مگر بات نہیں سنی۔

"خویشی سے یہاں کے کئی جاگیردار شیعہ حضرات سے اپیل کی کہ وہ ضلعی سطح پر اپنی دولت پڑھے لکھے شیعہ نوجوانوں کے لیے کوئی ادارہ قائم کریں مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔وہاں ضامن جیسے لوگ ہم سادہ عوام کو استعمال کرتے ہیں"(43)

یہاں ناول نگار نے مثال دی ہے کہ شیعہ مسلک افراد خود اپنے بندوں کے ساتھ بھی رویہ غیر جانبدارانہ رکھتے ہیں ان کی مالی حالت اور گھر کے حالات کا انھیں کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔یہ تمام سہولتیں صرف اشرافیہ کیلئے ہیں وہ صرف اپنی خوشیوں کو فرض عین سمجھتے ہیں۔

انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ حکومت کا بنا ہوا جال ہوتا ہے جس میں وہ اشرافیہ کو اپنی مرضی سے گھماتے ہیں۔وہ دونوں مسلکوں کے ساتھ کھیل کھیلتی ہے، وہ چاہتی ہے یہ دونوں الگ ہو جائیں، بٹ کر رہ جائیں اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔اشرافیہ ویسا ہی کرتی ہے جیسا حکومت چاہتی ہے۔مار تو صرف نیچے والے طبقے کو پڑتی ہے۔اگر شیعہ لوگوں کو دیکھا جائے تو وہ اپنا مطالبہ پورا کر لیتے ہیں تو سنی صدر اس بات میں کامیاب ہو جائے گا کہ شیعہ لوگ مضبوط ہیں، ان کے پاس زیادہ طاقت ہے اور پھر سے فساد پیدا ہو جائے گا اور یہ سلسلہ جاری ہو جائے گا۔

"میں یہ نہیں کہتا۔شیعہ اشرافیہ اپنی قوم کا قتل چاہتی ہیں مگر وہ اپنی معصومیت اور تھوڑے فائدے کے لیے پوری قوم کو رسک میں ڈال

رہے ہیں''(44)

مصنف نے اسی رویے کو بنیاد بتایا ہے کہ جب نچلے والا طبقہ پس رہا ہوتا ہے تو فسادات ہوتے ہیں۔ ناطق تو خود ہی ان تخلیق کاروں میں سے ہیں جو تقسیم سے خائف نظر آتے ہیں، تو پھر وہ شیعہ سنی میں ہونے والے فسادات پر کیسے راضی ہوتے۔ اسی صورتحال کے پیش نظر ناول نگار نے لکھا ہے کہ ایسا معاشرہ جہاں یہ فسادات ہوں اور اپنے ہی اس کی وجہ ہوں، نچلہ طبقہ پس کر رہ گیا ہو تو ایسے معاشروں میں مفلوک حال لوگوں کی خوشیاں ایسے ہی ادھوری ہوتی ہیں۔ ہر وقت دل کو بس کسی دھڑ کے کا ڈر لگا رہتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ سوگواری کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہی اشرافیہ جو افراد کو اپنے فائدے کیلئے استعمال کرتی رہی پھر جب ضرورت پڑی تو کسی اپنے کی جان لے لی مصنف اس پہ خائف نظر آتے ہیں۔

''بیٹا حاجی فطرس صاحب کو آج صبح نماز فجر کے وقت امام بارگاہ
جاتے ہوئے کسی نے گولی ماردی ہے وہ شہید ہو گئے ہیں''(45)

ضامن جو فطرس صاحب کے بہت قریب تھا۔ بچپن سے ہی ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہا، ہر سوال کا جواب وہ ان سے پاتا تھا تو انہیں اس طرح جاتے دیکھ کر ایک بات اس کے ذہن میں گھومنے لگی کہ فطرس صاحب نے بھی اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا تھا کہ وہ بھی ایک دن اس اشرافیہ کے کارناموں کا نشانہ بن جائیں گے۔ گویا ایسا ہی ہوا۔ ناول نگار نے حالات وواقعات کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ وہ ایک کے بعد ایک واقعہ بیان کرتے ہیں ان میں ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے جو قاری کے دماغ کو گہرائی میں لے جاتا ہے کہ ڈوری کیسے بندی ہوئی ہے۔ کون، کہاں اور کیسے استعمال کیا جا رہا ہے اور جب یہ فسادات نہیں رکتے تو پھر ایک کے بعد ایک حادثے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ آپ کو کس طرح استعمال کیا جائے گا کوئی نہیں جانتا۔ مصنف کہ مطابق فسادات یونہی نہیں ہو جاتے بلکہ ان کے پیچھے سوچی سمجھی سازش ہوتی ہے۔ جس کا نشانہ سادہ لوگ بنتے ہیں۔

"اس لیے کہ میرے والد شیعہ ٹارگٹ کلنگ میں قتل ہو گئے ہیں۔
آپ انہیں شہید کہہ سکتے ہیں اور اب یہ میرا حق بھی ہے۔"(46)

قاری کے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے تاثر رہ گیا کہ ضامن کے باپ کو جب نشانہ بنایا گیا

اوراس سے پہلے حاجی فطرس علی کوتوان کی اموات شہادت کو پائیں گی۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کی بنا پر قتل ہورہے تھے۔ناول نگار اس لیے یہ مسلک بندی خصوصاً شیعہ مسلک کی طرف شک آمیز لہجہ اپنائے ہوئے ہیں۔وہ خود کو مذہب میں بندھا ہوا انسان نہیں جب کہ حق بات پر ڈٹ جانے والا کہتے ہیں وہ ناپسند کرتے ہیں ایسا اقتدار رکھنے والوں کو جو مفاد پرست ہیں۔

یقیناً کماری والا ناول کو ناطق نے جامع انداز میں پیش کیا ہے۔قاری کے لیے یہ اس کے علم کے خزانے سے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔اس کا پلاٹ نہایت منظم اور مضبوط ہے۔ناول معاشرے میں موجود پسماندگیوں کی نہ صرف نشاندہی کرتا ہے بلکہ ان پس ماندگیوں کو پیدا کرنے والے اسباب پر بھی کاری ضرب کرتا ہے۔ناطق جن کرداروں کو پیش کرتے ہیں وہ ثقافتی،سماجی،نسلی،گروہی اور قومی حوالوں سے بے مثال ہیں۔وہ کرداروں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ناول نگار ایک اچھا کہانی گو ہے جس نے تنظیموں کے ساتھ ساتھ حکومتی سطح پر ہونے والے ناجائز کاموں کے علاوہ نچلے طبقے میں بھی جڑ پکڑنے والے جرائم کی نشاندہی کی ہے جہاں قاری یہ تمام حالات وواقعات پڑھ کر سکتے میں آجاتا ہے وہاں انہی حالات وواقعات کی مدد سے اس کی ذات میں شعور پیدا ہوتا ہے۔

کہانی کو نہایت ہی خوبصورت انداز میں ترتیب دیا گیا ہے۔گویا اختتام پر ایک اداس لہر دل میں خلش کی طرح رہ جاتی ہے۔مگر قاری کا کوئی بھی سوال تشنہ نہیں رہتا۔اسے اپنے تمام سوالوں کے جواب مل جاتے ہیں۔ناطق کو تنہائی پسند نہیں کہا جاسکتا لیکن وہ تنہا انسان ہے،وہ قاری کو اپنا ساتھی بنالیتا ہے،دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور جذبات کی رو میں بہہ کر وہ اپنے ساتھی کو ان تمام برائیوں سے آگاہ کردینا چاہتا ہے جو معاشرے میں پردے کے پیچھے پنپ رہی ہیں۔کہانی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ناول نگار کے دل میں بے شمار باتیں تھیں،درد تھا،جس کا برملا اظہار وہ قاری کے ساتھ کرکے اپنے درد کی تسکین کرتے ہیں۔یہ فن پارہ ان کے تلخ تجربات کا ترجمان ہے۔

جدید ناول نگاروں کی بات کی جائے تو ان میں ناطق ایک اہم ناول نگار کے طور پر ہمارے سامنے آئے ہیں۔مذکورہ ناول بھی ایک آپ بیتی کے طور پر سامنے آیا ہے جس کی ساری کہانی ایک کردار ضامن کے منہ سے سنانے کی کوشش کی گئی ہے۔کہانی میں رومانوی عناصر بھی موجود ہیں۔ایک مرکزی کہانی کا بیان کنندہ ضامن مختلف اوقات میں مختلف عورتوں کی محبت میں گرفتار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔اس

کے علاوہ مذکورہ ناول میں حکومت کا صحت کے حوالے سے عام دیہاتیوں کے ساتھ ناروا سلوک دکھایا گیا ہے۔ دیہاتوں میں قتل و غارت کے علاوہ باہمی دشمنی کی بڑے خوبصورت انداز میں منظر کشی کی گئی ہے۔ پوری کہانی کے اسلوب، منظر کشی، فرقہ واریت، قتل و غارت، پلاٹ اور مناسبت کے حوالے سے بہتر ہوگا کہ حوالہ جات اور کرداروں کی مدد سے تجزیہ کیا جائے۔ کہانی میں دیہاتی زندگی کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح دیہات کے لوگ آپس میں زمین اور جائیداد کے معاملات میں دشمنی پال رکھتے ہیں اور کس طرح گاؤں اور دیہات کے لوگ آسانی سے قتل و غارت گری کی بھرپور عکاسی بالکل درست انداز میں قاری کے سامنے آتی ہے۔ بلکہ خونی رشتوں میں بھی ایک دشمنی اور چپقلش دکھائی گئی ہے، بھائی اپنے بھائی کا قتل صرف اس بنیاد پر کر دیتا ہے کہ وہ اس کی زمین اپنے اختیار میں لے لے گا، یا اپنے چچا کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی نیت سے اسے قتل کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یقیناً ناول کا پلاٹ انتہائی خوبصورت اور مربوط ہے۔

ناطق نے شوبزنس کے نام پر کھلنے والی سیکس انڈسٹری کا جس طرح سے خلاصہ کیا ہے، ہر فرد کے لیے شعور کی ایک نئی راہ قائم کی ہے۔ عام انسان ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے، اسی لیے نچلے طبقے میں زیادہ تر لوگ اداکاری کے نام پر اس دلدل کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اردو ادب میں ان کا یہ قدم بہت دلیرانہ ہے۔ عصری ادب میں یہ ایک لازوال اضافہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ صدیقی، عظیم الشان، اردو ناول، آغاز و ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008ء، ص:32

2۔ ایضاً، ص:33 3۔ ایضاً، ص:34

4۔ ناطق، علی اکبر، کماری والا، جہلم بک کارنر، لاہور، 2021ء، ص:16

5۔ ایضاً، ص:17 6۔ ایضاً، ص:35

7۔ ایضاً، ص:37

8۔القرآن،سورۃالاعراف،آیات:81،80

9۔ناطق،علی اکبر،کماری والا،جہلم بک کارنر،لاہور،2021ء※ ص:43

10۔(حضرت لوط علیہ السلام)مطبوعہ روزنامہ جنگ،سنڈے میگزین،لاہور،31مارچ2019ء

11۔ناطق،علی اکبر،کماری والا،جہلم بک کارنر،لاہور،2021ء※ ص:360

12۔ایضاً،ص:61

13۔ایضاً،ص:63

14۔ایضاً،ص:69

15۔ایضاً،ص:76

16۔ایضاً،ص:124

17۔ایضاً،ص:143

18۔ایضاً،ص:307

19۔ایضاً،ص:367

20۔ایضاً،ص:367

21۔ایضاً،ص:371

22۔ایضاً،ص:376

23۔ایضاً،ص:380

24۔ایضاً،ص:387

25۔ایضاً،ص:397

26۔ایضاً،ص:500

27۔ایضاً،ص:506

28۔ایضاً،ص:507

29۔ایضاً،ص:509

30۔ایضاً،ص:522

31۔ایضاً،ص:538

32۔ایضاً،ص:557

33۔ایضاً،ص:557

34۔ایضاً،ص:540

35۔ایضاً،ص:574

36۔ایضاً،ص:583

37۔ایضاً،ص:574

38۔ایضاً،ص:575

39۔ایضاً،ص:209

40۔ایضاً،ص:210

41۔ایضاً،ص:210

42۔ایضاً،ص:334

43۔ایضاً،ص:335

44۔ایضاً،ص:525

45۔ایضاً،ص:597

46۔ایضاً ص:597

☆☆☆☆☆☆☆

کتابیات

بنیادی ماخذات

☆ ناطق علی اکبر، بے یقین بستیوں میں، سٹی پریس بک شاپ، کراچی، 2010ء

☆ ناطق علی اکبر، درعدالت علے، عکس پبلیکیشنز، لاہور، 2020ء

☆ ناطق علی اکبر، ریشم بنا کھیل نہیں، سانجھ پبلیکیشنز لاہور، 2019ء

علی اکبر ناطق اکیسویں صدی کے معروف ناول نگاروں میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں تہذیب ، ثقافت، سیاست، اور سماجی ناہمواری سمیت کئی موضوعات نظر آتے ہیں۔ انیلہ مشتاق نے جس خوبصورت انداز میں ناطق کے ناولوں میں پسماندگی کے مظاہر کو اجاگر کیا ہے، قابلِ تعریف ہے۔ انیلہ ایک استاد ہے اور استاد کو جس باریک بینی سے کسی ادب پارے کا تجزیہ کرنا چاہیے وہ اس سے بخوبی واقف ہے۔ امید ہے اس کی یہ کاوش اردو ادب میں اسے ایک نقاد کے طور پر متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ یہ انیلہ کے ادبی سفر کا آغاز ہے، منزل نہیں۔

ڈاکٹر مشتاق عادل

صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ

نام: انیلہ مشتاق

ولدیت: مشتاق احمد بٹ

ملازمت: لیکچرر شعبہ اردو

تعلیمی قابلیت: ایم فل اردو

بی ایڈ، ایم ایڈ

ڈپلومہ اِن کمپیوٹر آفس مینجمنٹ

رہائش: سیالکوٹ سٹی

Husn e Adab Faisalabad
03217044014, 03457763014